دنیا کے سیاسی نظام کا انجام

مولف: مرتضی شیرودی
مترجم: منہال حسین خیرآبادی

بیشتر مکاتب فکر اور مذاہب اس دنیا میں ایک بہتر نظام قائم کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔آخری تین دہائیوں میں دانشوروں اور صاحبان فکر و نظر کے نزدیک مدینہ فاضلہ سے متعلق تین نظریہ پائے جاتے ہیں: فوکویاما کا نظریہ ''تاریخ کا خاتمہ''، ہنٹنگٹن کا نظریہ ''تہذیبوں کی جنگ'' اور امام خمینیؒ کا نظریہ ''سیاسی اسلام''۔اس وقت دینی جمہوریت (اسلامی جمہوریہ) نے دنیاوالوں اور دانشوروں کے اذہان کو اپنی جانب معطوف کر دیا ہے جس نے ایک نئی دنیا بنانے اور ایک نیا نظام قائم کرنے کا نعرہ دیا ہے۔ حقیقت میں ایک نئی دنیا بنانے کے لئے اس وقت تین نظریئے پائے جاتے ہیں جنہیں دو نظام حکومت؛ لیبرل جمہوریت جس کے طرفدار فوکویاما اور ہنٹنگٹن کے نظریات ہیں اور دینی جمہوریت جس میں امام خمینیؒ اور امام زمانہ(عج) کے نظریات شامل ہیں، میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس وقت ایک نئی دنیا بنانے اور مدینہ فاضلہ تعمیر کرنے کی صلاحیت کس نظام میں ہے ؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے مختلف نظاموں کے اصول و قوانین اور ان سے متعلق نظریات کے سلسلہ میں تحقیق ضروری ہے:

۱. فوکویاما کا نظریہ ''تاریخ کا خاتمہ'' اور ہنٹنگٹن کا نظریہ ''تہذیبوں کی جنگ'' کو پیش کیا جائے گا اور پھر اس کا جائزہ لیا جائے۔
۲. لیبرل جمہوریت کے بعض عیوب اور نقائص بیان ہوں گے جو حقیقت میں مذکورہ دو نظاموں کی اصل و اساس ہیں۔
۳. امام خمینیؒ کا نظریہ ''سیاسی اسلام'' اور اسلامی جمہوریہ، ایک ایسا نظام ہے جس کے متعلق امید کی جاتی ہے کہ وہ آخری اور مکمل حکومت یعنی امام زمانہ(عج) کی حکومت کے قیام کے مقدمات فراہم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

۴. آخر میں مستضعفین عالم کی حکومت پر مبنی نظریہ اور اس کی خصوصیات کو بیان کیا جائے۔

مذکورہ تمام نظاموں کے سلسلہ میں تحقیق اور اسلامی جمہوریہ کو ایک مطلوب نظام اور مستضعفین عالم کی آخری حکومت پر قلم فرسائی مقالہ کی بنیاد ہے۔

فوکویاما (Fukuyama)

فرانسیس فوکویاما، امریکہ کے محکمہ خارجہ کے سیاسی پروگراموں کے نائب ڈپٹی کمشنر تھے۔ انہوں نے ۱۹۸۹ء میں "قومی مفادات" نامی مجلّہ میں اس نظریہ کو بیان کیا۔ انہوں نے سب سے پہلے اسے ایک مقالہ کی صورت میں منظر عام پر پیش کیا اس کے بعد اسی موضوع پر ایک کتاب "The End of History and the Last Man" یعنی "تاریخ کا خاتمہ اور آخری انسان" کے نام سے لکھی۔ ان کی نظر میں لیبرل جمہوریت، انسانی سماج کا آخری اور کامل نظام حکومت ہے۔ انسانوں کی تاریخ بھی ایک منظّم مجموعہ کا نام ہے جس کا سب سے بڑا حصہ لیبرل جمہوریت کی جانب گامزن ہے، فوکویاما اپنے نظریہ کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"تاریخ کا خاتمہ اس وقت ہوگا جب اسے ایک ایسا نظام مل جائے جو اس کے مطالبات اور ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ نظام اس وقت لیبرل جمہوریت کی شکل میں مغربی دنیا میں موجود ہے جس میں اس کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کی صورتیں رکھی گئی ہیں اور یہ کہنا مناسب ہوگا کہ آج کا انسان تاریخ کے ایک ایسے موڑ پر کھڑا ہے جہاں وہ موجودہ نظام حکومت سے الگ تھلگ کوئی نیا نظام قائم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اس لئے کہ موجودہ نظام کو بہتر بنانے اور بنیادی طور پر اس کے سدھار کے امکانات ناپید ہیں"۔

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر وہ رقمطراز ہیں:

"تاریخ انسانیت کی آخری دہائیاں گواہ ہیں کہ لیبرل جمہوریت اپنے رقیبوں جیسے شہنشاہیت، فاشیزم اور کمیونزم کے مقابلے میں فاتح رہا اور اس وقت پوری دنیا پر اس کا قبضہ ہے، لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ لیبرل جمہوریت، انسانوں کی ترقی کی آخری منزل اور حکومت بشری کی آخری صورت ہے۔ اگر ایسا مان لیا جائے تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ تاریخ کے خاتمہ کا وقت آپہنچا ہے، یہ حکومتی نظام حقیقت میں لیبرل اقدار کی کامیابی اور آئیڈیولوجی کے میدان میں جنگ و جدال کے خاتمہ کا نام ہے"۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

''میں تاریخ کے خاتمہ کا معتقد ہوں اس لئے کہ تاریخ ایک منظّم اور متغیر مجموعہ کا نام ہے جو ہر دور میں انسانوں کے تجربوں سے مل کر بنی ہے۔ تاریخ کو اس زاویہ سے دیکھنے والا پہلا دانشور جرمن کا باشندہ ہیگل ہے اور مارکس نے اسی مفہوم کو پرورش دینے کے بعد اسے ہمارے روزمرہ کے مباحث میں تبدیل کر دیا''[1]۔

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ فوکویاما کا نظریہ جدید نہیں بلکہ قدیمی نظریہ ہے جسے مارکس نے اس سے پہلے تفصیلی طور پر بیان کیا تھا۔ مارکس کا ماننا تھا کہ معاشی جبریت (یہ نظریہ خود مارکس کا تھا جو قائل تھا کہ دنیا کے تمام واقعات اقتصادی داؤ پیچ کا کھیل ہے اور حقیقت میں یہ نظریہ اختیار کے مقابلے میں جبر پر قائم ہے جو ایک فلسفی نظریہ مانا جاتا ہے) کی بنیاد پر تاریخ کی جدلیاتی حرکت اپنی انتہا یعنی کمیونیزم پر پہنچ جائے گی۔ اس مرحلہ میں ہر قسم کی خامی، عیب و نقص اور تضاد ختم ہو جائیں گے۔ حقیقت میں یہ دور انسانوں کے لئے ایک افسانوی دور ہوگا جس میں اسے پوری آزادی ملے گی اور ایک ایسی دنیا ابھر کر سامنے آئے گی جس میں ذات پات اور رنگ و نسل اور حکومت کا کوئی نام و نشان نہ ہوگا، لیکن تاریخ کی جدلیاتی حرکت کا مفہوم در حقیقت جرمن کے مشہور فلسفی Georg Wilhelm Friedrich Hegel سے لیا گیا ہے۔

ہیگل وہ پہلا فلسفی دانشور ہے جس نے تاریخ کے تکامل کو انسان کی ابتدائی خود آگاہی سے اس کی انتہا تک کی خود آگاہی پر مشتمل نظریہ کو پیش کیا ہے۔ اس کی نظر میں خود آگاہی کی ارتقا اور تکمیل اور مختلف تاریخی ادوار کے سماجی نظام اور تنظیموں (جیسے قبائلی نظام، غلامی کا دور، تھیوکریسی اور آخر میں جمہوریت) کے درمیان اٹوٹ رشتہ ہے۔ ہیگل کی نظر میں انسان، حقیقت میں تاریخ اور سماج کے حالات و شرائط کے ذریعہ تربیت پاتا ہے۔ تاریخ اپنی جبری حرکت کے نتیجہ میں جو واقعیت اور عقلانیت کی کھلی ہوئی تجلی کا نام ہے، مقام مطلق تک پہنچ جاتی ہے جہاں سماج اور حکومت کی عقلانی صورت ابھر کر سامنے آتی ہے، بالفاظ دیگر ہیگل کی نظر میں گذشتہ ادوار میں آزادی کچھ ہی لوگوں کے لئے تھی اور انسانوں کا بیشتر طبقہ اس سے محروم تھا۔ اگلے مرحلے میں تھوڑی بہت ترقی ہوئی اور آزادی، سماج کے ایک خاص طبقہ کو نصیب ہوئی لیکن تاریخ کا آخری اور کامل مرحلہ ایسا ہوگا جس میں آزادی، تمام انسانوں سے متعلق ہوگی اور اس وقت انسانیت کو اپنا واقعی اعتبار حاصل ہوگا اور اس کے اقدار ابھر کر سامنے آئیں گے[2]۔

---

۱. غلام رضا علی بابائی، فرہنگ روابط بین الملل، ص ۵۷۔

۲. ایضاً۔

فوکویاما نے ہیگل اور مارکس کے نظریہ کی جس انداز میں تفسیر کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مارکس سے زیادہ ہیگل کے نظریہ سے متاثر لیبرلیزم کی کامیابی پر یقین رکھتا تھا، یعنی اس کا ماننا تھا کہ سماج اور حکومت فاتح ہیں نہ کہ کاریگر اور مزدوروں کا طبقہ۔ الیکزنڈر کیژو نے ہیگل کے نظریات کی تفسیر میں ایک کتاب تحریر کی ہے اور فوکویاما نے خاتمہ تاریخ کی اصطلاح کو اسی تفسیر سے اخذ کیا ہے۔

فوکویاما کا یہ ماننا ہے کہ اس وقت دنیا عالمی پیمانہ پر کامیابی کی جانب گامزن ہے اور اس کے فرضیہ کے مطابق ہمارا دور اس وقت ہیگل کی خلاقیت کو جامہ عمل پہنا رہی ہے۔ اس کی نظر میں اگر ہم طویل مدت تک باقی رہنے والا بہترین نظام تلاش کرنا چاہیں تو وہ سیاسی اور اقتصادی لیبرلیزم کی پابندی ہے۔ فوکویاما اپنے نظریہ میں تیسری دنیا کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتا ہے بلکہ اپنی تحریر یوں طنز کرتا ہے:

"ابھی تک تیسری دنیا تاریخ میں سرگرداں ہے اور اس میں اس حد تک حیران ہے کہ دنیا کی نظریاتی تبدیلی میں اس کا اپنا کوئی کردار نہیں ہے"۔

فوکویاما کے نظریہ کا دارومدار اس بات پر ہے کہ اس نے تاریخ کی حرکت کے لئے ایک مترقی بنیاد قرار دی ہے جو اس مسیر میں اپنی انتہا کو پہنچے گی اور پھر انسان کو اپنی ذاتیات کی شناخت کروانے اور آرزوں کو محقق کرنے میں کامیابی حاصل ہوگی اور شاید جرمن کے فلسفی دانشور ہابرمس (Habermas) کے مطابق، تاریخ کا خاتمہ بہت ہی غم انگیز ہوگا، اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ انسان نظریاتی جنگ کے بجائے، اقتصادی حساب و کتاب، ماحولیات کے سلسلہ میں فکرمندی اور روزمرہ کی ضرورتوں کو پوری کرنے میں مشغول ہو جائے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو پھر ایسے دور میں ہنر اور فلسفہ کے بدلے انسان کی روح کو میوزیم کے شیشوں میں ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھنے کی بات ہوگی۔

فوکویاما نے اپنی کتاب میں تاریخ سے متعلق اپنا نظریہ بیان کرتے ہوئے علم و دانش کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے، جب کہ خود علم کو سرمایہ داری کے ذریعہ جان ملتی ہے تاکہ اس طرح انسانوں کی ضروریات کو پورا کرسکے۔ فوکویاما کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس وقت تاریخ کے اس موڑ پر کھڑے ہیں، جہاں ابھی ہمارے پاس اتنی طاقت نہیں ہے کہ ہم موجودہ صورت حال کو بدل کر اسے مترقی بنا سکیں تو اس احتمال کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ تاریخ خود ہی اپنے اختتام کو پہنچ جائے[۱]۔

---

۱. محمد توحید فام، فرہنگ در عرصہ جہانی شدن؛ چالش ہا و فرصت ہا، ص ۲۱۹۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ امریکی نظریہ پرداز فوکویاما نے اپنے اس نظریہ کو کمیونیزم کی شکست کے بعد پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ دنیا کی تاریخ اپنے مقصد اور اختتامی مراحل سے قریب ہو چکی ہے اور لیبرل جمہوری نظام واحد سیاسی نظام ہے جو باقی رہنے والا ہے، یعنی فوکویاما کمیونیزم کی نابودی کو نہ صرف سرمایہ داری نظام کی بقا کا باعث سمجھتا ہے بلکہ مارکسیسم کے سقوط کو لیبرل جمہوریت کے اختتامی مراحل سے نزدیک ہونے کا سبب سمجھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کمیونیزم کے مقابلے میں مغربی دانشوروں کے شدید عکس العمل اور نوستراداموس کی پیشین گوئی کے مطابق مغربی نظام کی نابودی اس طرح آپس میں مدغم ہوئی کہ عوام اسے دنیا کا خاتمہ سمجھ بیٹھی اور یہ اتفاق ایک جدید نظریہ کے جنم لینے کا باعث ہوا جسے ہنٹنگٹن اور فوکویاما نے فلسفہ کے آئینہ میں دنیا والوں کے سامنے پیش کیا[۱]۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ مسلسل ارتقا اور پے در پے حوادث و وقائع کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، اور فلسفہ تاریخ کا فرض یہ ہے کہ تمام وقائع کا خلاصہ کرے اور ایک جامع نظریہ کی شکل میں اسے منظر عام پر پیش کرے۔ معلوم ہوا کہ تاریخ کا خاتمہ ایک مبہم اور مہمل عنوان ہے، جیسا کہ Jean Baudrillard اپنی کتاب ''خاتمہ کا توہم'' اور ایک انٹرویو میں فوکویاما کے نظریہ کا مذاق اڑاتے ہوئے اسے احمقانہ اور سطحی قرار دیا ہے اور پھر اپنے اعتبار سے دنیا کے حالات و شرائط کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اب تاریخ کسی ہدف کی تلاش میں نہیں ہے، اب اس میں ارتقا نہیں ہے، اب اس کی حرکت کسی خاص مسیر کی جانب نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکل سکے کہ وہ جس راستے پر جارہی ہے وہ کامیابی تک پہنچے گی یا ناکامی کا منھ دیکھے گی۔ اس فلسفی دانشور کی نظر میں کمیونیزم کے خاتمہ کے بعد بھی مارکس ابھی تک باقی ہے، اس لئے کہ اس کے نظریہ میں کچھ اہم نکات ہیں جو ابھی تک معتبر مانے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس فلسفی دانشور کی نظر میں مارکس نے جو نظریہ قائم کیا ہے اور جو تحلیل و تفسیر کی ہے وہ ختم ہونے والے نہیں ہیں[۲]۔

مذکورہ بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ فوکویاما کی نظر میں مورد بحث مسئلہ یہ نہیں ہے کہ مغربی اقدار اور اشیا بہتر ہیں یا نہیں، بلکہ وہ مغربی اقدار اور تہذیب کو غیر مغربی دنیا میں پھیلانے کے در پے ہے۔ پس معلوم ہوا کہ فوکویاما اپنے نظریہ کے ذریعہ مغربی افکار، آئیڈیالوجی، افعال و کردار اور حالات و شرائط کو دنیا کے دیگر جوامع اور تہذیبوں میں عام کرنا چاہتا ہے، اس نظریہ کے مطابق بہترین اشیاء اور بے مثال اقدار صرف اور صرف مغربی دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ اس کا نظریہ، مغربی افکار و نظریات کی

---

۱. رامین، جہان بگلو، نقد عقل مدرن، ص۸۷۔

۲. ایضاً، ص۱۰۱۔

عالمی فتحیابی کا مظہر ہے۔اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ آج کے دور میں بیشتر ممالک سرمایہ داری کو اقتصادی اور سیاسی ترقی کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں، اس کامیابی کو قطعی و مسلّم فرض کرلیا گیا ہے۔ بہر حال ہم اس بات کو نظرانداز نہیں کرسکتے کہ مغربی تہذیب کے ذریعہ دیگر ممالک کی تہذیبیں شکل و جہت پاتی ہیں اور اس کے اقدار عقب ماندہ ممالک کے عوام اور ان کے دانشوروں کے لئے نمونہ بنتے جارہے ہیں۔ فوکویاما کا نظریہ مغرب کی مادی اور غیرمادی اشیاء و اقدار کی برتری کو پیش کرنے سے کہیں زیادہ مذکورہ ذہنیت کی برتری کا قائل ہے، دنیامیں بہت کم ممالک ایران جیسے ہیں جو اسلامی معارف سے وابستہ ہونے کی وجہ سے فوکویاما جیسے لوگوں کے نظریات اوراس نظریہ کا واضح مصداق یعنی امریکی سیاست کے عالمی ہونے کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے ہیں۔یعنی فوکویاما کے نظریہ کو حقیقت میں ان نظریات کا حصہ سمجھنا چاہئے جو آئیڈیالوجی کے خاتمہ یا بالفاظ دیگر امریکی آئیڈیالوجی سے متعلق ہیں۔ جیسا کہ GerardAraud اور Mongin Olivie نے ۱۹۸۹ میں امریکہ سے شائع ہونے والے مجلّہ اسپریٹ میں یہ تحریر کیا کہ تاریخ کے خاتمہ کا اعلان امریکی طرز فکر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ امریکی آئیڈیالوجی نفی تاریخ پر استوار ہے[۱]۔ چونکہ اس میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ دنیا کی ذمہ داری کو نبھاسکے اس لئے اس نے اپنے علاوہ سب کی نفی کی ہے اور اپنے آپ کو سب کچھ سمجھ بیٹھا ہے۔

ہنٹنگٹن (Samuel P. Huntington)

ہنٹنگٹن دوسرے دانشوروں کی طرح سرد جنگ کے خاتمہ کو نظریاتی جنگ کا خاتمہ نہیں مانتا بلکہ اسے تہذیبوں کے تصادم کا نیادور بتاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس نے دنیا کے وقائع اور حوادث کی اس انداز میں تحلیل و تفسیر کی جو اس کے نظریہ کے مطابق ہوں۔ اس دانشور نے جیسے ہی تہذیبوں کے تصادم پر مبنی نظریہ قائم کیا، دنیا کے تمام علمی، فرہنگی، سیاسی اور مذہبی مجامع میں شدت سے بحث و گفتگو شروع ہوگئی۔ ایران میں اس نظریہ پر مبنی مطبوعہ مقالے اور کتابیں درج ذیل ہیں:

۱. محمد علی اسلامی ندوشن، ''کدام رویاروئی'' دوماہنامہ اطلاعات سیاسی۔اقتصادی، ش ۷۵، ۷۶
۲. امید فرہنگ، ''ماچگونہ بر غرب تاثیر می گذاریم''، فصلنامہ گفتگو، دی ۷۲ ۱۳
۳. داریوش شایگان، ''چند گانگی فرہنگی''، فصلنامہ گفتگو، دی ۷۲ ۱۳
۴. ساموئل ہنٹنگٹن، ''رویاروئی تمدن ہا''، ترجمہ مجتبی امیری، دو ماہنامہ اطلاعات سیاسی۔اقتصادی، ش ۶۹، ۷۰

---

۱. نقد عقل مدرن، ص ۱۰۱۔

۵. مجتبیٰ امیری، ''نظریہ رویارویی تمدن ہا از دیدگاہ متفکران'' دو ماہنامہ اطلاعات سیاسی۔ اقتصادی، ش ۷۳، ۷۴

۶. ''نبرد آیندہ'' گفتگو باساموئل ہنٹنگٹن''، ترجمہ حمید عضدانلو، ماہنامہ کلک، ش ۴۲، شہریور، ۱۳۷۲

ہنٹنگٹن کے نظریہ کے مخالفوں کی فہرست بڑی طویل ہے، بلکہ بعض سیاستدانوں کا یہ ماننا ہے کہ اس طرح کے مسائل کو ایسے بحرانی دور میں منظر عام پر لانا سیاسی اعتبار سے ٹھیک نہیں ہے، اسی طرح بعض مغربی دانشوروں کا یہ ماننا ہے کہ یہ نظریہ بہت ہی سست اور بے بنیاد ہے، اور اسے مغربی سماج میں موجودہ اخلاقی گراوٹ اور معنوی بحران کی پردہ پوشی اور دنیاوالوں کے سامنے ایک متمدن و متحد سماج پیش کرنے کی ناکام کوشش بھی بتایا ہے۔

جیمز کورث تمام مخالفین میں سر فہرست ہے جس نے مغربی سماج میں موجودہ مشکلات اور کمیوں سے چشم پوشی کرنے کی بناپر ہنٹنگٹن کی ملامت کی ہے۔ وہ اپنے ایک مقالہ ''واقعی تصادم'' میں سب سے پہلے عصر جدید میں مفاہیم کے ٹکراؤپر عمیق نظر ڈالتے ہوئے اور ہنٹنگٹن کے نظریہ کو پیش کرنے کے بعد اس پر تنقید کی ہے۔اس کی نظر میں مغربی سماج بہت سی تبدیلیوں کا سرچشمہ ہے اور حقیقی تصادم کہیں اور نہیں بلکہ خود مغربی سماج مخصوصا امریکہ میں پیش آئے گا۔ فرہنگی اختلافات اور فمینزم وہ عوامل اور اسباب ہیں جو مغربی تہذیب میں تصادم کا باعث بنیں گے، بلکہ مغربی تہذیب میں مغربی اور غیر مغربی تہذیبوں کا ٹکراؤ اجتناب ناپذیر ہے۔ اس کی علامتیں اور نشانیاں بھی ایک ایک کر کے منظر عام پر آرہی ہیں جیسے کہ آج امریکی سماج میں مختلف افکار و نظریات کے حامل افراد جن کا تعلق مختلف طبقات سے ہے وہ امریکی سیاست کے میدان میں نبرد آزما ہیں[۱]۔

جہاں دنیا کی علمی اور فرہنگی انجمنوں نے ہنٹنگٹن کے نظریہ ''تہذیبوں کا تصادم'' کی کھل کر مخالفت کی وہیں بعض سیاسی اور غیر سیاسی دانشوروں نیز یورپ اور امریکہ کی بعض بانفوذ انجمنوں نے ہنٹنگٹن کے نظریہ کو قابل غور بھی قرار دیا ہے اور موجودہ عالمی مسائل میں اس نظریہ کو اہمیت بھی دی ہے جیسا کہ ایشیائی امور کے ماہر گراہم فولر Graham Fuller اپنے ایک مقالہ ''فراسوی جنگ سرد'' میں لکھتا ہے:

> ''اس وقت دنیا تہذیبی اعتبار سے ایک زبردست بحران کا شکار ہوچکی ہے، مغربی تہذیب کی برتری پر مبنی فرضیات، اسلامی تہذیب اور کنفوسیوسی تہذیب کی جانب سے بے امان حملات کا شکار ہے، چنانچہ دنیا کے اکثر مقامات جو مغربی منافع سے الگ تھلگ سمجھے جاتے ہیں وہ اس وقت

---

۱. داریوش شایگان، چند گانگی فرہنگی، فصل نامہ گفتگو، دی، ۱۳۷۲ش، ص ۶۷۔

عالمی سیاست میں اپنی حیثیت بنانے اور مقام پانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں، یہ وہ رقابت اور لڑائی ہے جو مستقبل میں اقتصادی، سیاسی ٹکراؤ حتی لشکر کشی کا باعث بھی بن سکتی ہے"۔

گراہم فولر نے اپنی آخری کتاب میں تہذیبوں کے تصادم اور مغرب کی اسلام سے دشمنی کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

یورپ کے بعض دانشور عالمی حالات و شرائط پر مبنی ہنٹنگٹن کے نظریہ کے طرفدار نظر آتے ہیں، جیسا کہ Institute of International Relations of Germany کے ڈائرکٹر میچل اسٹرمر اپنے ادارہ کی نئی کاوشوں کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تہذیبوں کا تصادم ایک خطرناک امر ہے جس میں نیٹو سے ملحق ممالک مستقبل میں مبتلا ہوں گے۔

ان کے مقابلے میں وہ غیر مغربی دانشور جنہیں جنگ سرد کے حالات و شرائط بخوبی یاد ہیں، وہ تہذیبوں کے ٹکراؤ کو سوچی سمجھی پالیسی سمجھ رہے ہیں اور اختلاف پر مبنی مغربی سیاست کو اس کا سرچشمہ گردانتے ہیں تاکہ وہ اس نظریہ کے ذریعہ ترقی پذیر ممالک کے منافع پر آسانی سے قبضہ کر سکیں، اگرچہ سطحی فکر کے افراد بھی موجود ہیں جو علمی و فلسفی داؤ پیچ سے بچنے کے لئے ہنٹنگٹن کی سیاہ و سفید دنیا کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں۔ وہ لوگ اس نظریہ کی حمایت کے خطرناک نتائج اور انجام سے چشم پوشی کرتے ہوئے اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اسے دارالاسلام اور دارالحرب جیسے نظریات پر منطبق کر دیں جب کہ مغربی اور غیر مغربی دانشوروں کی اکثریت نے تہذیبوں کے تصادم پر مبنی نظریہ کا جائزہ لیا ہے اور اکثر اس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ جنگ سرد کے بعد نظریاتی دنیا میں جو بحران پیدا ہوا تھا، ہنٹنگٹن نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اس کے ذریعہ اس دور میں پیدا ہونے والے سیاسی و غیر سیاسی نظریات میں تجدید نظر اور عالمی حالات و شرائط پر نظر ثانی کے لئے دانشوروں کو مجبور کر دیا اور آخر کار انہیں یہ ماننا پڑا کہ ابھی تک ہنٹنگٹن کے نظریہ کا کوئی بدل نہیں مل سکا ہے۔

ہنٹنگٹن کا ماننا ہے کہ ماضی کے برخلاف، مستقبل میں رونما ہونے والے بین الاقوامی تنازعات قوموں کے شناختی بحران کا نتیجہ ہوں گے اس لئے کہ ابھی تک یہ شناخت حکومتوں کی اقتصادی یا سیاسی آئیڈیالوجی کے ذریعہ ہوا کرتی تھی لیکن اب وہ اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے تہذیب کی دنیا میں نئے عناوین کی تلاش میں ہیں۔

ہنٹنگٹن ایک مقام پر کہتا ہے:

"جنگ سرد کے بعد موجودہ تہذیبوں کے مالک ممالک، بڑی طاقتوں کا مقام حاصل کر لیں گے، اس کے بعد عالمی قدرت کا کوئی مطلب باقی نہیں رہے گا، اس کے بعد کوئی بھی ملک بلکہ امریکہ

کے لئے بھی منفعت کی دنیا میں کوئی حکمت عملی نہیں ہو گی، مستقبل کی دنیا تہذیبوں کی بنیاد پر قائم ہو گی اور یہ ایک اجتناب ناپذیر قدم ہے''۔

تہذیبوں کے تصادم پر مبنی نظریہ کا مطالعہ کرنے اور اس پر وارد ہونے والی تنقید کو دیکھنے کے بعد درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

۱. نظریہ ''تہذیبوں کا تصادم'' ایک جدید نظریہ ہے جو عالمی مسائل کو حل و فصل کرنے میں بڑی اہمیت کا حامل ہے لیکن اس کے ثقافتی اور علمی گوشوں کو نظر میں رکھنا بہت ضروری ہے۔

۲. تہذیبوں کا تصادم ایک اسٹراٹیجیک نظریہ ہے لہٰذا اسے سیاسی عینک سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

۳. اس نظریہ کے بعض پہلو بہت اہم اور روشن ہیں لیکن اس کی بنیادیں بہت سست ہیں اور خارج میں موجود بے شمار واقعیتوں اور حقیقتوں سے ناسازگار ہے[۱]۔

۴. ہنٹنگٹن مغربی سربراہوں سے درخواست گزار ہے کہ وہ مغربی تہذیب کو دوبارہ رائج کرتے ہوئے اس کی حفاظت کریں اور اس سلسلہ میں وہ یورپ سے زیادہ امریکہ کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ اس کی نظر میں مغربی تہذیب کی حفاظت کے لئے درج ذیل اہداف کو حاصل کرنا بہت ضروری ہے:

الف: تمام مغربی ممالک کو سیاسی، اقتصادی اور لشکری اعتبار سے متحد ہونا ہو گا تاکہ دیگر تہذیبوں پر قائم ممالک اپنے اختلافات کو مغربی ممالک کے ذریعہ حل کریں اور ان سے مشورہ لیں۔

ب: روس کو ارٹھوڈکس فرقہ کا اصلی مرکز ماننا ہو گا اور اس کی علاقائی قدرت کو جنوب کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے جائز منافع کے ساتھ تسلیم کرنا ہو گا۔

ج: تمام مغربی ممالک کو یورپی یونین اور نیٹو میں شامل کرنا ہو گا جیسے سلوینیا اور کروشیا وغیرہ۔

د: جنوبی امریکہ کے باشندوں کو مغربی تہذیب میں مدغم ہونے کے لئے مدد کرنا ہو گا اور ان سے نزدیکی روابط قائم کرنا ہو گا۔

ھ: مسلم ممالک اور چین کی ہر قسم کی طاقت کو ختم کرنا ہو گا۔

و: جاپان کی مغربی ممالک سے دوری کو کم اور چین سے دوری کو بڑھانا۔

ز: دیگر تہذیبوں اور ممالک کے مقابلے میں مغربی ممالک کی فوجی ٹکنالوجی میں برتری لانا ہو گی۔

جب مذکورہ اہداف جن میں سے بعض کا آغاز بھی ہو چکا ہے پورے ہو جائیں گے تو دنیا کی دیگر

---

۱. مجتبیٰ امیری، نظریہ برخورد تمدن ہا، ہنٹنگٹن و منتقدانش، ص ۲۲۔

تہذیبیں یا نابود ہو جائیں گی یا وہ پوری طرح مغربی تہذیب کے سامنے تسلیم ہو جائیں گی[۱]۔

فوکویاما اور ہنٹنگٹن دونوں دنیا میں لیبرل جمہوریت قائم کرنا چاہتے ہیں، جب کہ ہم نے سابقہ دو نوں نظریہ ''تہذیبوں کا تصادم'' اور ''دنیا کا خاتمہ'' پر جو نقد کئے ہیں ان کے علاوہ درج ذیل موارد بھی ہیں جو ان دونوں نظریات پر نقد کی فہرست میں شامل ہیں:

۱. فرد محوری

لیبرل جمہوریت کا دنیا کے دیگر نظاموں کے مقابلے میں سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس میں انتہائی درجہ کی فرد محوری پائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سماج میں رہنے والے زن و مرد عام حالات میں ایک دوسرے سے مستقل اور سماج سے ہٹ کر ہیں، یعنی ان کا اتصال اور ملاپ ان کی فطرت کے مطابق نہیں ہے بلکہ ان کے تعلقات ذاتی منافع اور مقاصد کے تابع ہیں، اسی لئے روابط اور تعلقات ایک قسم کے ابزار شمار کئے جاتے ہیں، لہٰذا تمام سیاسی، اقتصادی اور فرہنگی اداروں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے افراد کے منافع کو فراہم کریں اور یہ منافع آزادی کے سایہ میں ہی قابل حصول ہے اور وہ تمام اصول و قوانین جو کسی فرد کی آزادی کو ختم کرنا چاہیں، غیر قابل قبول ہیں اس لئے کہ وہ فرد کی آرزوؤں تک رسائی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

فرد محوری پر تنقید کے حوالہ سے کہا جاسکتا ہے کہ عام حالات میں انسانوں کا ایک ساتھ جمع ہو کر زندگی بسر کرنا نہ تنہا مادی منافع کی خاطر ہے بلکہ بعض اوقات معنوی، روحی اور انسانوں کی انسانی ماہیت کا تقاضہ بھی ہوتا ہے، پس سماجی موسسات صرف اور صرف فردی منافع کی دیکھ ریکھ کے لئے نہیں ہیں کہ ان کی مشروعیت اس کے ذریعہ حاصل ہو، اسی طرح منافع کو حاصل کرنے کی راہ میں سماجی موسسات اور آزادی، بعض اوقات رکاوٹ بھی ڈال دیتے ہیں[۲]، اس لئے کہ یہ سماجی موسسات بیوروکریسی کو ہوا دینے کے ذریعہ اہداف کی راہ میں رکاوٹ ڈال دیا کرتے ہیں۔

۲. عمومی منافع کی غلط تفسیر

---

۱. ایضاً۔

۲. انڈرو لوین، طرح و نقد نظریہ لیبرال دموکراسی، ترجمہ سعید زیباکلام، ص۶۰۔۷۸؛ شہریار زرشناس، زنگ‌ہای انحطاط و رسوایی برای نظام ہای لیبرال، دموکراسی، روزنامہ قدس، ۱۹ بہمن، ۱۳۸۱، ص ۱۲؛ وت جونز، خداوندان اندیشہ سیاسی، ترجمہ: علی رامین، ج ۲، ص ۳۶۲۔

لیبرل جمہوریت میں عمومی منافع کا مطلب ہر وہ چیز ہے جسے جمہوری طور پر انتخاب کرلیں یا وجود میں لائیں، بعض اوقات لیبرل جمہوریت میں عمومی منافع روسو کی تعریف کے مطابق اجتماعی منافع کے برابر قرار پاتے ہیں جب کہ روسو کے نزدیک عمومی منافع اور سماجی منافع کے درمیان بہت فرق ہے اور وہ ان دونوں کی یکسانیت کا قائل نہیں ہے،، اس مطلب پر تنقید کرتے ہوئے اس طرح کہاجاسکتا ہے : لیبرل جمہوریت میں عمومی منافع یا عمومی تعلقات کا ایک خاص مطلب ہے جس کی بناپر غیر معقول خواہشیں اور آرزوئیں بھی اس میں شامل ہوجاتی ہیں، لیبرل جمہوریت کا ایک ہدف یہ بھی ہے کہ وہ منافع کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرے اور جمہوری قواعد ایسے ہی منافع کو حاصل کرنے کا ایک راستہ اور ذریعہ ہے۔لوین، لیبرل جمہوریت میں مستعمل عمومی منافع کے مفہوم کوابہام آمیز قرار دیتے ہوئے کہتا ہے :

> ''لیبرل جمہوریت میں عمومی کا مطلب فرد فرد کی جمع ہے، جب کہ جمعی منافع میں جمعی کا مطلب سماج کے ہر فرد کے منافع کی حفاظت ہے۔ اس کے علاوہ منافع یا تعلقات کا مفہوم، عقل عملی کا ثمرہ ہے اور اس میں بھی ایک ابزاری کیفیت پائی جاتی ہے یا اس میں بھی عقل، عواطف و احساسات کی قید و بند میں ہوتی ہے''[1]۔

۳. رہائی نہ کہ آزادی

لوین، لیبرل جمہوریت کے موافق آزادی کی تعریف بیان کرنے سے پرہیز کرتا ہے جس کی بناپر وہ بطور مستقیم لیبرل جمہوریت میں آزادی کے مفہوم کا تجزیہ نہیں کرتا، اس لئے کہ اس کا عقیدہ ہے کہ لیبرل جمہوری خواہوں نے آزادی کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں اسی لئے اس کی پوری کوشش یہ ہے کہ ان کی تمام تعریفوں کے ماحصل کو پیش کرے۔ لیبرل جمہوریت میں آزادی کا مطلب ہے : اہداف تک پہنچنے کی راہ میں کسی قسم کی محدودیت اور رکاوٹ کا نہ ہونا، آزادی کی اس تعریف کا مطلب یہ ہے کہ فرد کو ہر قسم کے قید و بند سے آزاد کر دیا جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب سے زیادہ ذاتی منافع ہمیشہ سب سے زیادہ آزادی کے سایہ میں حاصل نہیں ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح کہ جیسے عام حالات میں سماج پر کسی حکومت کے نہ ہونے سے افراتفری مچ جاتی ہے یا حد سے زیادہ آزادی اہداف تک پہنچنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جایا کرتی ہے یا کم از کم اس کی حرکت کچھوے کی چال سے بھی زیادہ آہستہ ہوجایا

---

۱. طرح و نقد نظریہ لیبرال دموکراسی، ص۹۵، ۱۰۵؛ اسٹٹون تانسی، مقدمات سیاست، ترجمہ: ہرمز ہمایوں پور، ص۲۷۷۔

کرتی ہے پس یہ امر لوگوں کے نفع میں ہے کہ وہ اپنے منافع کے حصول کی راہ میں بعض محدودیتوں اور رکاوٹوں کو قبول کرلیں[۱]۔

۴. نظریاتی اختلاف

ایک سیاسی نظریہ کے لحاظ سے جمہوریت میں لیبرلیزم کا امتزاج غیر ممکن ہے، جس کی وجہ سے لیبرل جمہوریت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا لیبرل فیصلے اور جمہوری فیصلے ایک سیاسی نظریہ میں ادغام ہو سکتے ہیں؟ کیا وہ دونوں لفظ مرکب کی طرح اکٹھا ہو سکتے ہیں؟

لیبرل جمہوریت کے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جمہوری فیصلے خیر جمعی (اجتماعی مفاد) کو لیبرلی یعنی خیر فردی (انفرادی مفاد) کی خاطر قربان کردیا جائے، لیکن لیبرل جمہوری خواہ واضح صورت میں یہ بیان نہیں کرتے کہ لیبرلی فیصلے کیا ہیں؟ ابھی تک جو چیز مشاہدہ سے ثابت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ کبھی خیر جمعی کو ترجیح دیتے ہیں اور کبھی خیر فردی کو مقدم کردیتے ہیں یعنی ان کا کردار کبھی لیبرلیزم کا آئینہ تو کبھی جمہوریت کا آئینہ ہوتا ہے، اگر لیبرلیزم جمہوریت میں جمہوری اور لیبرل عناصر کو ایک جگہ اکٹھا ہونا ہے یا لیبرل اصول کی جمہوری اصول کے مقابلے میں حفاظت کرنا ہے تو لیبرلیزم اور جمہوریت کو ایک دوسرے کے اصول کو نقض نہیں کرنا چاہئے اس لئے انہیں لیبرلیزم کے اصول کو واضح انداز میں بیان کرنا چاہئے بلکہ دونوں کے حدود کو معین کرنا ہوگا، لیبرلیزم کے حدود کو معین نہ کرنا اور جمہوریت کے حدود کو کھلا چھوڑ دینا لیبرل جمہوریت کی مشروعیت کے لئے نقصان دہ ہے۔

۵. وضع قوانین

لیبرل جمہوریت میں قانون بنانے کا حق صرف اور صرف عام لوگوں کو ہے نہ کہ خدا کو۔ انسانوں کے ذریعہ قانون بنانا بہت سی خرابیوں کا باعث ہے جیسے:

الف: ایک انسان دوسرے انسان کے لئے ایک جامع اور مانع قانون ہرگز وضع نہیں کرسکتا؛ کیونکہ انسانی معرفت کے تین راستے یعنی حس، تجربہ اور عقل انسانوں کی واقعی ضرورتوں کو سمجھ نہیں سکتے۔

ب: ابھی تک انسانوں نے جو قوانین بنائے ہیں وہ زیادہ تر خود قانون بنانے والوں کے حق میں اور ان کے منافع کے ضامن رہے ہیں، چونکہ یہ حقیقت ہے کہ جب قوانین انسانوں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں تو

---

۱. فریدریش فون ہائیک، آزادی عقل وسنت، ترجمہ عزت اللہ فولادوند، ص۳۲۱، طرح ونقد نظریہ لیبرال دموکراسی، ص۷۰، ۶۰۔

قانون گزاروں کے منافع اور ان کی ضرورتیں ملحوظ ہوتی ہیں اور انسانوں کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے منافع کی محدودیت کو ہر گز پسند نہیں کرتے۔

ج: اقلیت میں رہنے والے لوگ اکثریت میں رہنے والے لوگوں کے قوانین کو تحمل کرنے کیلئے مجبور ہوں گے، اور وہ اپنی باطنی ناراضگی کے باوجود اس پر عمل کرنے کے لئے مجبور رہیں گے۔

د: انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین زیادہ تر انسانوں کی فطرت میں شامل نہیں ہیں اسی وجہ سے اسے عام مقبولیت نہیں حاصل ہوتی ہے جس کے نتیجے میں بار بار نئے قوانین بنانے پڑتے ہیں یا ان کو نافذ کرنے کے لئے طاقت کا استعمال کرنا پڑتا ہے[۱]۔

۶. ناصالح افراد کا انتخاب

لیبرل جمہوریت میں حکومت چلانے والے لوگ عام انسانوں کے ذریعہ اور دینی پہلوں پر توجہ دیئے بنا انتخاب کئے جاتے ہیں یعنی اس طریق کار میں لوگوں کی توجہات کو اپنی طرف معطوف کرنے کے لئے اور انہیں خوش کرنے کے لئے ہر ممکن راستہ اپنایا جاتا ہے تاکہ عوام کی اکثریت کے ذریعہ وہ حکومت کے اعلیٰ مناصب کو حاصل کر سکیں۔ اس انتخاب پر دو اعتراض وارد ہیں:

الف: اگر لوگوں کے ووٹ کے ذریعہ کوئی ہوس کا اسیر، لالچی، نااہل، فاسق و فاجر اور جاہل انسان حکومت کے کسی اعلیٰ منصب پر فائز ہو جائے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ سماج نابودی، بربادی اور پستی کی طرف ڈھکیل دیا جائے گا، جس کی وجہ سے عقل اس راستہ کو ہر گز قبول نہیں کر سکتی اس لئے کہ اس میں سماج کی تباہی مسلم ہے[۲]۔

ب: عام طور پر الیکشن میں بہت کم باصلاحیت لوگ شرکت کرتے ہیں اور اگر شریک بھی ہوگئے تو بہت کم انہیں انتخاب کیا جاتا ہے اس لئے کہ جو لوگ دولتمند اور اثر و رسوخ والے ہیں وہ پیسے اور زیادہ سے زیادہ پروپیگنڈے کے ذریعہ کرسی کو حاصل کر لیتے ہیں اور جو شائستہ ہوتے ہیں وہ دولتمند نہ ہونے کی وجہ سے اور اثر و رسوخ نہ رکھنے کی بنا پر حاشیہ میں ڈال دیئے جاتے ہیں[۳]۔

---

۱. عبد الرحمٰن عالم، تاریخ فلسفہ سیاسی غرب (عصر جدید و سدہ نوزدہم) ص۴۳۶؛ مصطفیٰ کواکبیان، دموکراسی در نظام ولایت فقیہ، ص۵۸، ۴۸۔

۲. تاریخ فلسفہ سیاسی غرب، ص۴۵۴؛ نظریہ سیاسی اسلام، ص۲۹۳۔

۳. علی غفوری، اسلام و اعلامیہ جہانی حقوق بشر، مجموعہ حقوق بشر از منظر اندیشمندان، ص۴۶۳؛ علی میر سیاسی، دموکراسی یا حقیقت، ص۱۰۳ و ۱۰۸۔

۷. گمراہ کن پروپیگنڈے

گمراہ کن پروپیگنڈے کے ذریعہ ووٹ بنانا یا لوگوں کے ووٹ خرید نا لیبرل جمہوریت کا سب سے بڑا عیب اور نقص ہے، جب کہ لوگوں کی اکثریت جھوٹی تبلیغات اور پروپیگنڈے کی وجہ سے ہمیشہ دھوکہ میں رہتی ہے۔ کیا یہ قطعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ لوگوں سے حاصل ہونے والا ووٹ واقعی ہے ؟! یہ جملہ حقیقت میں روسو کی تائید کرتا ہے کہ جس نے کہا تھا:

"کسی بھی قوم کو فاسد نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کی اکثریت کو گمراہ ضرور کیا جاسکتا ہے، یہ وہ مرحلہ ہے جس میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ایسی قوم اپنے نقصان کی خود درپے ہے"۔

مغربی الیکشن کی مہم اور اس کے پروپیگنڈوں میں تین اہم نقص پائے جاتے ہیں :

الف: کسی بھی طرح اور جیسے بھی ممکن ہو لوگوں کا ووٹ حاصل کرنا یعنی ہدف وسیلہ کی توجیہ کرتا ہے۔

ب: تبلیغات اور پروپیگنڈے کا مقصد مخاطب سے قدرت تحلیل کو چھین لینا ہے لہٰذا جب سماج کا ایک فرد ووٹ دیتا ہے تو اپنی اس ذہنیت کے مطابق دیتا ہے جو اس کے دل ودماغ میں ترسیم کی گئی ہے۔

ج: الیکشن کے میدان میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جن کے پاس پروپیگنڈہ کرنے کے ابزار اور وسیلے زیادہ ہوں[۱]۔

۸. سیاسی بے توجہی

لیبرل جمہوریت کا نظام نمایندگی پر قائم ہے، الیکشن کے بعد حکومت کی باگ ڈور نمایندوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور ووٹ دینے والے عوام اس سے کہیں دور ہوتے ہیں، یعنی سیاسی پارٹیوں کے ہوتے ہوئے، لیبرل جمہوریت میں انہیں ایسے دور میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے سے منع کردیا جاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی نقطہ نظر سے ووٹ دینے والوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور یہ مسئلہ ہمارے دور میں بہت ہی زیادہ قابل محسوس ہے کہ عوام ووٹ دینے کے بعد کالعدم ہوجایا کرتے ہیں اس لئے کہ :

الف: میڈیا کی فراوانی اور اس کے ذریعہ لوگوں کی معلومات میں اضافہ کے باعث لوگ اپنے منتخب نمایندوں کی نااہلی کو سمجھ گئے ہیں، جس کی بناپر لوگوں نے میدان سیاست میں اپنی حصہ داری کو کم کردیا ہے اور یا اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے سے کترانے لگے ہیں، اس کے علاوہ مختلف علوم وفنون

---

۱. پل سوئزی وادوارد باتالو، نقدی بر پارہ ای از نظریہ ہای رایج در سرمایہ داری غرب، مترجم فرہاد نعمانی ومنوچہر سناجیان، ص۱۹؛ حمید مولانا، ظہور وسقوط مدرن، ص۲۳۵، ۲۴۲۔

کی فراوانی، سماج کی دیکھ ریکھ میں رکاوٹوں کا باعث ہوا ہے اس لئے کہ منتخب لوگوں کا علم کے تمام شعبوں میں ماہر ہونا ناممکن ہے۔

ب: کچھ لوگ، دولت اور طاقت کے سہارے قانون گذاروں پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کو حواس باختہ بنادیتے ہیں۔

ج: ہر قسم کے جغرافیائی، سیاسی اور سلامتی خطرات بڑھ گئے ہیں اور قانون گزاروں کا عوام سے فاصلہ بڑھ گیا ہے یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے سے بآسانی ملاقات نہیں کر سکتے[۱]۔

۹. انسان محوری

لیبرل جمہوریت کی بنیاد، انسان محوری ہے، یعنی انسان ایک عقلمند مخلوق کا نام ہے جو اپنے ہوش وخرد کی مدد سے فردی اور سماجی زندگی کو کسی غیبی مدد کے بغیر بہترین صورت میں چلا سکتا ہے، یعنی وہ اپنی زندگی میں خدا کی مدد کا محتاج نہیں ہے اور اس سے مدد لینے کی اسے کوئی ضرورت نہیں ہے، جس کی بناپر وہ کسی دوسری طاقت سے مدد لئے بغیر قانون گزاری کے لئے سب سے بڑا حقدار ہے، تو معلوم ہوا کہ لیبرل جمہوریت میں خدااور دینی مقولات جیسے وحی، قیامت اور دیگر دینی مفاہیم کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ جب کہ آج ہم شاہد ہیں کہ مغربی ممالک کا ایک طبقہ معتقد ہوچکا ہے کہ وہ گمراہی اور تاریکی سے نجات پانے کے لئے خدا کا محتاج ہے اور اس کے بغیر یہ امر غیر ممکن ہے، جنوبی امریکہ میں کچھ ایسے لوگ ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ دوبارہ خدا کو مغربی ممالک میں لانا ہوگا تاکہ وہ جس دلدل اور گمراہی میں گرفتار ہیں انہیں اس سے نجات دلاسکے۔ امریکا کے کچھ عیسائی گروہ یہ چاہتے ہیں کہ دین حکومتی امور میں مداخلت کرے لیکن یہ کوشش معنوی خلا کر پر کرنے کے لئے نہیں بلکہ پوی دنیا پر امریکا کا قبضہ دلانے کے لئے ہے[۲]۔

۱۰. عدم مساوات

نظریہ پرداز اور سیاسی دانشور جان رالز کا ماننا ہے کہ لیبرل جمہوریت میں اقتصادی اور اجتماعی اعتبار سے عدم مساوات پائی جاتی ہے اور اسے ختم کرنا نہ اس کے لئے ممکن ہے اور نہ ہی اس کے لئے سود مند ہے، اس لئے کہ اس نظام کے حامیوں کا ماننا ہے کہ عدم مساوات، رقابت کا باعث ہے اور یہ چیز قدرت وطاقت اور ثروت اندوزی کا بہترین ذریعہ ہے، لیکن اس کے ذریعہ فقر دور نہ ہوگا اور دولت لوگوں کے درمیان بطور

---

۱. علی اسدی، افکار عمومی وارتباطات، ص۳۱۔

۲. سی، بی مکفرسون، جہان واقعی دموکراسی، ترجمہ علی معنوی تہرانی، ص۶۸۔

مساوی تقسیم نہ ہوگی۔ رالز یہ چاہتا ہے کہ عدم مساوات کو اچھے انداز میں کنڑول کیا جائے تاکہ دولت و ثروت اور طاقت سماج کے فقیر ترین اور نادار ترین لوگوں کے درمیان عادلانہ طور پر تقسیم ہو۔ رالز کی بات سے یہ نکتہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ ہر گز عدم مساوات کو ختم کرنے کا خواہاں نہیں ہے بلکہ وہ بہترین انداز میں اس عدم مساوات کو سماج کے فرد فرد کے درمیان تقسیم کرنے کا طرفدار ہے، دوسری طرف اس کا یہ بھی ماننا ہے کہ ہر فرد کے لئے میسر نہیں ہے کہ وہ لیبرل جمہوریت میں سیاسی اور اجتماعی مناصب کے لئے زور آزمائی کر سکے[۱]۔

۱۱. آزادی سے جنگ

حقیقی جمہوریت اور لیبرل جمہوریت کے درمیان فرق یہ ہے کہ حقیقی جمہوریت میں آزادی کا ایک دائرہ ہے، اس کے حدود ہیں لیکن لیبرل جمہوریت میں آزادی ہر قسم کے قید و بند سے رہائی کا نام ہے، اس طرح جمہوریت کو آزاد جمہوریت اور پابند جمہوریت میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ آزاد جمہوریت وہ حکومتیں ہوا کرتی ہیں جنہیں عوام اپنے ووٹ کے ذریعہ برسر کار لاتے ہیں اور لوگوں کے مطالبات کو پورا کرنا ان کا فرض ہوتا ہے۔ آزاد جمہوریت حقیقت میں وہی مغربی لیبرل جمہوریت ہے۔ اس جمہوریت میں آزادی سے مراد ہر قسم کے انسانی اور دینی قید و بند سے آزادی اور رہائی ہے۔ آزادی کا یہ مطلب حقیقی آزادی سے برسر پیکار ہے۔ پس انقلاب کے ناخداؤں کو لیبرلیزم کے جال میں پھنسنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی انقلاب اور عوام محور تبدیلیوں کو عوام فریبی سے جمع کئے گئے ووٹ کے ذریعہ مبادلہ کریں اور خون پسینے سے حاصل شدہ انقلاب کو نادان لوگوں کے ہاتھوں کا کھلونا نہ بننے دیں۔ اس باب میں مغربی دانشور، فرائیڈرچ نیچہ لیبرل جمہوریت کی مذکورہ باتوں کی وجہ سے شدت سے اس کی مخالفت کرتا تھا اور اس کا عقیدہ تھا کہ اس نظام میں آزادی، جمہوریت اور حقوق بشر کا استعمال ریا، جھوٹ اور مکاری پر موقوف ہے اور وہ آزادی کے نام پر جہاں عوام اور دنیا والوں کو دھوکہ میں رکھے ہوئے ہیں وہیں وہ لوگ اپنے آپ کو بھی دھوکہ دے رہے ہیں،، فوکویاما اور ہنٹنگٹن لیبرل جمہوریت میں موجودہ مشکلات کو بیان کرنے اور امریکن سماج میں اس کے برے اثرات کو قبول کرنے کے بعد معتقد ہیں کہ مغربی دنیا میں لیبرل جمہوریت کے اعتبار سے

---

۱. نقدی، برپارہ ای از نظریہ ہای رائج در سرمایہ داری غریب، ص ۱۹۔

آزادی کا مفہوم، انسانوں کی ترقی اور تکامل کی راہ میں مددگار ہونے سے زیادہ ظلم و ستم اور جرم و جنایت میں اضافہ کا باعث ہے[۱]۔

۱۲. مفہومی بحران

لیبرل جمہوریت جن مشکلات سے دوچار ہے ان میں سے ایک مفہومی بحران بھی ہے، کچھ دہائیوں پہلے لیبرل جمہوریت ایک رویائی حکومت تصور کی جاتی تھی اور ہر ایک اس گمان میں تھا کہ بشری نظام ایک ایسی حکومت کی جانب گامزن ہے جس میں انسانوں کی تمام خواہشوں اور ضرورتوں کو پورا کیا جائے گا، لیکن آج اس تصور کے بالکل برخلاف مشاہدہ ہورہا ہے اور آج عملی طور پر لیبرل جمہوریت صرف اور صرف بعض ممالک میں قابل مشاہدہ ہے اور جن ممالک میں لیبرل جمہوریت کا دعویٰ کیا جارہا ہے وہاں بھی اگر واقعی طور پر دیکھا جائے تو وہ لیبرل جمہوریت نہیں بلکہ Aristocracy اور Oligarchy ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لیبرل جمہوریت کی شکل و صورت بدل چکی ہے۔ سماجیات کا مشہور فرانسیسی دانشور الن تورن Alain Touraine اپنی کتاب ''جمہوریت کیا ہے؟'' میں لکھتا ہے:

> ''جمہوریت کا دعویٰ ہے کہ وہ مطالبات کے تنوع کو قبول کرتی ہے، ان کا پورا احترام کرتی ہے، اور سماج کے ہر فرد کو اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنی فردی زندگی کو جیسے چاہے گذارے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے، اس لئے کہ فرانس کی جمہوریت اتنے بڑے بڑے دعوے کرنے کے باوجود اپنے اسکولوں اور کالجوں سے مسلمان لڑکیوں کو باہر نکالتی ہے، ان کے داخلے پر پابندی لگاتی ہے، ان کے حجاب پہننے پر پابندی عائد کرتی ہے اور ان کی تمام تر مخالفتوں اور مظاہروں کے باوجود ان کے مطالبات کو پورا کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی اور انہیں اپنے مخصوص انداز میں زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ لیبرل جمہوریت جہاں بے شمار مشکلات کا شکار ہے وہیں اس میں نظریاتی، اخلاقی اور سیاسی بے شمار مشکلات بھی ہیں جن کے پیش نظر دانشوروں کی نظر میں یہ مشکلات اس کے خاتمہ اور نابودی کا باعث ہوں گے''

۱۳. آزادی اور برابری کے مابین تنازع

---

۱. فرانسیس فوکویاما، پایان نظم سرمایہ اجتماعی وحفظ آن، ترجمہ: غلام عباس توسلی، ص۳۱، ۳۴؛ ساموئل، ہنٹنگٹن، تمدن ہا و بازسازی نظام جہانی، ترجمہ: مینو احمد سرتیب، ص۲۴۳۔

آزادی اور برابری کے درمیان تنازع غیر قابل انکار عنصر ہے جو مغرب کے فلسفہ سیاسی اور لیبرل جمہوریت میں پایا جاتا ہے، یعنی اگر سماج کے سبھی لوگ برابر ہوں تو ان کی آزادی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے؛ اس لئے کہ برابری کا قیام لوگوں کی شخصی زندگی میں حکومت کی مداخلت کا باعث ہوگی جس سے ان کی آزادی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، اسی طرح اگر سماج کے سبھی لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو ان کی برابری کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے، اس لئے کہ سماج کا ہر فرد اپنی آزادی سے فائدہ اٹھانے اور دولت جمع کرنے کی راہ میں دوسروں سے الگ تھلگ راہ و روش انتخاب کرتا ہے، پس ہر فرد کی دولت قطعاً دوسرے سے متفاوت ہوگی اور یہ تفاوت ان شرائط وحالات کا نتیجہ ہے جن میں وہ زندگی بسر کررہے ہیں اور وہ شرائط وحالات کچھ اور نہیں بلکہ نابرابری اور عدم مساوات ہے، Friedrich Hayek, Robert Nozick اور Milton Friedman جیسے دانشوروں نے بھی آزادی اور برابری کے درمیان تضاد پر مہر تائید لگادی ہے لیکن ہم عصر دانشور Joseph Schumpeter جیسے دانشوروں نے اس لئے آزادی اور برابری کو جمہوریت کا حصہ ماننے سے انکار کردیا ہے کہ جمہوریت ابھی تک ان دونوں کے درمیان تضاد کو ختم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ البتہ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت میں برابری کا تصور خیالی ہے، جمہوریت کا مطلب نہ تو انسانوں کے درمیان برابری ہے، اور نہ ہی دولت کے اعتبار سے مساوات ہے اور نہ ہی لوگوں کے لئے مواقع کی یکسان فراہمی ہے۔ سرمایہ داری، جمہوریت کی ہمزاد اور اس کے ہمراہ ہے، یعنی عدم مساوات۔

۱۴. مساوات کے دو رخ

لیبرل جمہوریت میں مساوات اور برابری کے دو رخ پائے جاتے ہیں، اس لئے کہ اقتصادی جمہوریت میں کسی قید و بند کے بغیر آزاد سرمایہ داری کا تصور ہوتا ہے اور کسی بھی قسم کے ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے ثروت اندوزی کا کام جاری رہتا ہے جس کا نتیجہ سماج میں امیر و فقیر دو حصوں میں لوگوں کا تقسیم ہو جانا ہے جسے سماجی عدم مساوات کا بھی نام دیا جا سکتا ہے، البتہ اقتصادیات میں ابزار اور وسائل کے (استعمال کے) اعتبار سے بھی کوئی مساوات نہیں ہوتی اور یہاں برابری اپنے واقعی مفہوم سے بہت دور ہو جاتی ہے[1]، لیکن سیاسی جمہوریت میں سبھی آزاد ہوتے ہیں اور سبھی کے ووٹ یکساں ہوتے ہیں اگرچہ اس میں بھی یہ امکان پایا جاتا ہے کہ غلط پروپیگنڈے اور جھوٹ، فساد کے ذریعہ لوگوں کے ووٹ خرید لئے جائیں لیکن یہ مسلم ہے کہ اقتصادی جمہوریت میں عدم مساوات، سیاسی جمہوریت سے کہیں زیادہ ہے، شاید یہ بات بھی

---

۱. میلتون فریدمن، سرمایہ داری وآزادی، مترجم غلام رضا رشیدی، ص۱۷، ۳۴۔

کہی جاسکتی ہے کہ سیاسی جمہوریت میں مساوات، آزادی پر قربان کر دی جاتی ہے اور اقتصادی جمہوریت میں آزادی کو مساوات، پر قربان کیا جاتا ہے۔

۱۵. اکثریت کے مظالم

لیبرل جمہوریت میں اکثریت کے قانون پر کچھ اعتراضات ہیں منجملہ یہ کہ اس نظام میں ہر انسان کو حق حاصل ہے کہ وہ ووٹ کے ذریعہ سیاسی اور حکومتی معاملات میں شریک ہو، ایسی صورت میں ووٹنگ کا مطلب یہ ہوگا کہ فیصلہ لوگوں کی اکثریت کے ذریعہ ہوگا لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سماج میں رہنے والے ہر فرد کے لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں ووٹ دینے کی صلاحیت ہے اور اس میں تشخیص کی لیاقت پائی جاتی ہے ؟

مولف کتاب ''مبادی فرانسہ معاصر'' اس سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتا ہے :

''اگر دس لاکھ نادان انسانوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو وہ ایک دانا اور عقلمند انسان کی برابری نہیں کر سکتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر نادانوں کی خطاؤں یا ان کے ووٹ کو جمع کیا جائے تو اس سے حقیقت کا استخراج نہیں کیا جاسکتا، کیا یہ مانا جاسکتا ہے کہ زیادی آبادی والے سماج کے لوگ یا کسی سماج کے زیادہ آبادی والے گروہ کے لوگ زیادہ عقلمند ہیں ؟ کیا یہ سچ ہے کہ اکثریت ہمیشہ سچ بولتی ہے اور برے لوگ ہمیشہ اقلیت میں رہتے ہیں ؟''

آندرہ تایو اسی سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے : قانون اکثریت کا نتیجہ، نالائق لوگوں کا حکومت کی کرسی پر بیٹھ جانا ہے، اس لئے کہ قانون اکثریت میں عام لوگوں اور ووٹ دینے والوں کو یہ حق دیا جاتا ہے کہ جن مسائل میں وہ کافی معلومات نہیں رکھتے ان کے سلسلہ میں اظہار نظر کریں اور یہ قانون لوگوں کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ ملک کو چلانے میں جو قدم اٹھانا چاہیں اٹھا سکتے ہیں اور اکثریت کی رائے کو آخری فیصلہ قرار دیتے ہوئے اقلیت میں رہنے والوں کے حقوق اور سیاسی امور میں ان کی مداخلت کو کم سے کم کر دیا جاتا ہے، اسی بات کو ایک دوسرے انداز میں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ لیبرل جمہوریت میں جس کے پاس پروپیگنڈے کے بہترین وسائل و ابزار ہوں وہ لوگوں کے ووٹ کو جمع کرنے میں اپنے رقیب سے زیادہ کامیاب ہے، اور چونکہ ایسے لوگ بیشتر اوقات غیر صالح ہوتے ہیں اس وجہ سے یہ امکان پایا جاتا ہے کہ نااہل اور غلط قسم کے لوگ اہم مناصب پر قابض ہو جائیں۔

۱۶. دولت کی حاکمیت

لیبرل جمہوریت میں دولتمند اور ان کے منافع واقعی اور حقیقی حاکم ہوا کرتے ہیں۔ اس نظام میں اجتماعی عدالت اور کمزوروں کی ضرورتیں اصل نہیں ہوا کرتیں۔ دولتمند اور طاقت ور لوگ اس نظام میں اس لئے سربراہ بن بیٹھتے ہیں کہ ان کے پاس لوگوں کے ووٹ جمع کرنے اور ان کو بہکانے کے بے شمار ابزار اور وسائل ہوتے ہیں، اسی لئے مغربی سماج میں موجود عدم مساوات، بے عدالتی اور ناامنی سے کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ سرمایہ داری نے اس نظام میں سب سے زیادہ جس چیز کو اپنا اسیر بنایا ہے وہ رائے عامہ ہے۔ مغربی سرمایہ داری نے اپنی میڈیا اور پروپیگنڈوں کے تمام ابزار و وسائل کے ذریعہ اس طرح لوگوں کے اذہان کو تسخیر کرلیا ہے کہ وہ جب چاہتے ہیں اور جیسے چاہتے ہیں، لوگوں کے ووٹ کو اپنے حق میں کرلیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لیبرل جمہوریت میں سرمایہ داری نے اپنا جال بچھا رکھا ہے اور الیکشن تو صرف اس لئے کرایا جاتا ہے تاکہ دنیا والوں کو بیوقوف بنایا جاسکے اور اس کے سایہ میں سرمایہ داروں کے منافع اور ناجائز خواہشات کو پورا کیا جاسکے۔ اس نظام پر سرمایہ داروں کا قبضہ، اس نظام کی تشکیل کے مقاصد کے خلاف ہے اس لئے کہ اسے لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بنایا گیا تھا، اس کا ہدف اور مقصد یہ تھا کہ لوگوں کی زندگی روز بہ روز ترقی کرے اور ان کی معیشت بہتر ہو لیکن اس نظام میں عوام کی معیشت کی بہتری کے بجائے دولتمندوں کی معیشت اور ان کی آسائش و آرام کو مد نظر رکھا گیا۔ ایک دوسری عبارت میں یوں کہا جائے کہ اس نظام میں اقتصاد سے متعلق تمام ابزار اور وسائل پر دولتمندوں کا قبضہ ہے۔ اقتصادی معیشت سرمایہ اور بازار کے تقاضوں یعنی ضرورت اور پیشکش کے مطابق ہوا کرتی ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ منفعت حاصل کرنے کے لئے دولتمندوں کی جانب سے بھرپور اقتصادی کارکردگی بھی ہوتی ہے۔

۱۷. اخلاقی انفرادیت

ایک جماعت کی تقدیر کے مقابلے میں ذمہ داری کا احساس، انسانیت کی شناخت کا اہم معیار اور انسان و حیوان کے درمیان فرق ہونے کی بہترین علامت ہے۔ لیبرل جمہوریت میں میدان سیاست کے ماسوا اجتماعی، اقتصادی اور ثقافتی شعبوں میں زندگی اور ایک دوسرے سے رابطہ کو بہت کمزور بنادیا گیا ہے، سماج میں رہنے والوں کے درمیان اجتماعی زندگی بسر کرنے کے احساس کو زندہ رکھنے کے بجائے انفرادی زندگی کو خوب ہوا دی ہے، ایسے سماج میں رہنے والا انسان اپنے ہی جیسے دیگر انسانوں سے اپنے درد و رنج کو تقسیم کرنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرتا ہے، مغربی سماج میں انسانی حقوق کا مسودہ، لیبرل جمہوریت کی بلندی کا سب سے اونچا نشان ہے، یہ مسودہ انفرادی حقوق کی بنیاد پر قائم ہوا ہے اور اس میں اجتماعی حقوق کا کوئی مقام نہیں ہے، اور عجیب بات تو یہ ہے کہ لیبرل جمہوریت میں اجتماعی منافع حاصل کرنے کے لئے تحزّب کا انعکاس

بہت ضعیف ہے جب کہ تحزب یعنی تعصب، عصبہ سے مشتق ہے جس کے معنی جمع اور جماعت کے ہیں اور اصطلاح میں ایک ایسے وسیلہ کو کہتے ہیں جو فرد کو اس کے انسانی ہم جنس جماعتوں سے ملحق کرتا ہے، تاکہ ان کی جانبداری کرے اور ان کے حقوق کا خیال رکھے، اگرچہ ہر قسم کی جانبداری کا نتیجہ انسانیت نہیں ہے اسی طرح ہر قسم کی بے توجہی اور حمایت نہ کرنا انسانیت سے بے توجہی کا مطلب نہیں ہے۔

۱۸. نادرست اجتماعی روایتوں کی حفاظت

لیبرل جمہوریت میں بعض غلط اور نادرست اجتماعی روایتوں کی شدت سے حفاظت کی جاتی ہے، حقیقت میں لیبرل جمہوریت بنیاد پرست ہے جس کی وجہ سے وہ لوگ مجبور ہیں کہ سماج کی موجودہ صورت حال کی حفاظت کریں یا تدریجی طور پر آہستہ آہستہ اس سے فاصلہ بڑھائیں، جس کی وجہ سے آج تک بے شمار روایتیں غلط ہونے کے باوجود مغربی سماج کا حصہ بن چکی ہیں، لیکن اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ لیبرل جمہوریت، اجتماعی تبدیلیوں کی راہ میں ممانعت ایجاد کرتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نظام میں تبدیلی اور موجودہ صورت حال کو بدلنے کی ترغیب نہیں دلائی جاتی جب کہ اگر ایسی غلط رسومات کو ختم کر دیا جائے تو بہت سی اجتماعی اور فردی مشکلات کا خاتمہ ہو سکتا ہے، اسی طرح لیبرل جمہوریت میں وہ تبدیلیاں جو اس کی ذات اور ماہیت سے متضاد ہے اسے وہ ہر گز قبول نہیں کرتی چونکہ اس صورت میں اسے مندرجہ ذیل اعتراضات کا سامنا کرنا پڑے گا:

الف: اگر لیبرل جمہوریت لوگوں پر قائم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ جس تبدیلی کو پسند کریں، اسے انجام دینا چاہئے خواہ اس سے نظام میں کمزوری پیدا ہو۔

ب: وہ نظام جو دنیا میں اپنی برتری کا دعویدار ہے، اس میں کوئی اشکال یا نقص نہیں ہونا چاہئے کہ لوگ ان اشکالات کی وجہ سے اس میں تبدیلی کے خواہاں ہوں اور اسی طرح اجتماعی مطالبات کی راہ میں ممانعت بھی ایجاد نہ ہوں۔

ج: جو چیز لیبرل جمہوریت کو اجتماعی بنیاد پرستی سے نزدیک کرتی ہے وہ لوگوں کی ووٹنگ میں پوشیدہ ہے۔

لیبرل جمہوریت کا نظام رائے عامہ سے وجود میں آتا ہے اور اسی بنیاد پر حکومت کے سربراہوں کو انتخاب کیا جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ عوام کسے منتخب کرتی ہے؟ عوام اس شخص کا انتخاب کرتے ہیں اور اسے ہی اپنا ووٹ دیتے ہیں جو ان کا محبوب اور من پسند ہو تو ایسا شخص جو لوگوں کی پسند و ناپسند کا خیال رکھتا ہو وہ ہر گز ان عادتوں اور نظام کو نہیں بدل سکتا جن کی عوام کو عادت سی ہو گئی ہے اور عوام اسے باقی رکھنا چاہتی ہے۔ ایسے انتخاب میں تعارض دکھائی دے رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسے نظام میں عوام پرانے

سربراہ کی جگہ ایک نئے سربراہ کا انتخاب کرتے ہیں لیکن وہ ہرگز ان روایتوں اور عادتوں کو ترک نہیں کرتے جو ان کے لئے نقصاندہ اور زیانبار ہیں[۱]۔

۱۹. معنویت کا بحران

لیبرل جمہوریت میں اصلی اور حقیقی معیار، لوگوں کی رائے اور ان کا ووٹ ہے اور منتخب لوگوں کے لئے اہم بات یہ ہے کہ وہ لوگوں کے پسند کی رعایت کریں اور عمل میں وہی راہ و روش اپنائیں جو لوگوں کو اچھی لگتی ہیں اور صرف وہی کام کریں جو لوگوں کے مزاج کے موافق ہو، وگرنہ عوام برسرکار سیاسی نظام کی ہرگز حمایت نہیں کریں گے اس لئے کہ لوگوں کو ہرگز پسند نہیں ہے کہ حکومت ان کی عادتوں اور ان روایتوں میں تبدیلی ایجاد کرے۔ اسی وجہ سے لیبرل جمہوریت میں بنیادی اعتبار سے تبدیلی نہیں ہوسکتی اور بنیادی تبدیلی سے متعلق بے رغبتی مادی امور سے کہیں زیادہ معنوی امور سے مربوط ہے، اس لئے کہ لیبرل جمہوریت میں مادی تبدیلی کو عوام اپنی خواہشوں کے مطابق گردانتے ہوئے قبول کر لیتی ہے لیکن معنوی تبدیلی مغربی سماج کے لئے ناقابل برداشت ہے[۲]۔

۲۰. حقیقی جمہوریت کے قیام کی شرطیں

اگر یہ مان لیا جائے کہ جمہوریت ہر قسم کے عیب و نقص سے مبرا اور پاک ہے تب بھی یہ نہیں مانا جاسکتا کہ یہ نظام تمام انسانوں کے حق میں مفید ہے اور ایک سماج کے ارتقائی مراحل کے لئے کارساز اور کارآمد ہے؛ اس لئے کہ کسی بھی سماج میں واقعی جمہوریت کو قائم کرنے سے پہلے لازم ہے کہ اس کے ضروری مقدمات فراہم کئے جائیں اس کے بعد واقعی جمہوریت کے قیام کا خواب دیکھا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ موانع اور رکاوٹیں جو واقعی جمہوریت کے قیام کی راہ میں آسکتی ہیں وہ کسی واقعی اور لائق رہبر کے ہاتھوں ختم کی جائیں نہ ان رہبروں کے ذریعہ جو فاقد صلاحیت ہوتے ہیں اور عوام انہیں اپنی رائے سے انتخاب کرتی ہے۔ ایک سماج میں نو ظہور جمہوریت کے لئے عوام کی جہالت اس کی واقعی اور حقیقی قیام کی راہ میں بہت بڑی مانع ہے اور اگر اس مشکل کو حل کرنے کے لئے کوئی راستہ نہیں نکالا جاتا تو پھر دنیا کی اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی طاقتیں جو جمہوریت کے دعویدار ہیں وہ اس جمہوریت کو اپنے ہاتھوں کا کھلونا بنالیتی ہیں۔ واقعی جمہوریت صرف انہیں سماج کے لئے مفید ہے جن میں اس کے قیام کے مقدمات فراہم ہوں۔

---

۱. حسین بشیریہ، لیبرالیسم و محافظہ کاری، ص ۲۸۲۔

۲. رابرت، اچ، یورک، لیبرالیسم مدرن افول امریکہ در سراشیبی بہ سوی گوموراہ، ترجمہ: الہہ ہاشمی حائری و حسین غفاری، ص ۶۸۳۔

جس سماج میں سیاسی اور ثقافتی مقدمات کے مہیا ہونے سے پہلے جمہوریت کا قیام عمل میں لایا جائے وہ ہر گز نجات اور سعادت کا باعث نہیں ہو سکتا[۱]۔

ابھی تک ہم نے لیبرل جمہوریت کے نقائص اور عیوب کو نظریاتی اعتبار سے پیش کیا ہے اور جو کچھ ہم نے ابھی تک بیان کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے عیوب بس اتنے ہی ہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ جس چیز نے لیبرل جمہوریت کی مشکلات کو آشکار اور اس کا پردہ فاش کیا ہے وہ میدان عمل میں اس کا کارآمد نہ ہونا ہے، اس دعوے کی دلیلیں بے شمار ہیں اور اگر کوئی ان سے مطلع ہونا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ مانوئل کی کتاب ''عصر اطلاعات و ظہور جامعہ شبکہ ای'' کا مطالعہ کرے۔

موجودہ مغربی لیبرل جمہوریت کی میدان عمل میں ناکامی کو جس چیز نے ہوا دی ہے، وہ حقیقت میں لیبرل جمہوریت کا اجتماعی مشکلات کو برطرف کرنے کے لئے انسان کو معیار بنانا ہے۔ لیبرل جمہوریت جن مشکلات کا شکار ہے اس سے خلاصی صرف اور صرف خدا کے ذریعہ ممکن ہے۔ خدا ہی اس اجتماعی مشکلات کو حل کرنے کا واحد ذریعہ ہے، اس لئے کہ اس کائنات کو خدا نے، اس کی تمام مخلوقات کے ساتھ خلق فرمایا ہے، ہر چیز اس کی مخلوق ہے، لہٰذا وہ اس دنیا کے امور اور اس کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے سب سے زیادہ دانا و توانا ہے، لہٰذا انسان کو قانون بنانے کا حق نہیں ہے مگر یہ کہ خدا کی جانب سے اسے اجازت حاصل ہو، کیونکہ انسانوں کے ہاتھوں تدوین ہونے والے قوانین، سعادت کے بدلے اس کے نصیب میں بدبختی و شقاوت لائیں گے، انسانوں کی سعادت اور اس کے ارتقا کی ضمانت لینے والا نظام صرف وہی ہو سکتا ہے جس میں اس کی فطرت اور اس کی خلقت کا لحاظ کیا گیا ہو۔ اور یہ مسلم ہے کہ خدا کے علاوہ کوئی بھی انسان کو اچھی طرح نہیں پہچانتا، پس یہ صرف اس کا حق ہے کہ وہ انسانوں کو جینے کا درس دے۔ اس دعوے کی دلیل جہاں دینی تعلیمات ہیں وہیں مغربی سماج کے انسانوں کے تجارب بھی ہیں، اس لئے کہ ان کے تجربے کے مطابق انسانوں میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ اپنی زندگی کا ایسا جامع دستور العمل تیار کر سکیں جو ان کی دنیوی اور اخروی زندگی کو سعادتمند بنا سکے اس لئے کہ انسان کی پہچان کے ذرائع، حس، تجربہ اور عقل محدود اور نسبی ذرائع ہیں جن میں خطا کا امکان بہت زیادہ پایا جاتا ہے بلکہ ان میں انسانوں کی جامع شناخت کی صلاحیت نہیں ہے اور نہ ہی ان میں اسرار عالم کی خبر گیری اور غیب و آخرت کی باتوں کو پتہ لگانے کی صلاحیت ہے۔

---

۱. ژان ماری گنو، پایان دموکراسی، مترجم عبدالحسین نیک گھر، ص ۱۳۱۔

مذکورہ باتوں سے معلوم ہوا کہ انسانوں کی زندگی کے لئے تنہا دینی نظام کارآمد ہے جس کی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو اس عالم کے اسرار سے واقف ہے اور صرف اسی میں اتنی طاقت ہے جو انسانوں کے لئے ایک ایسا مسودہ تیار کرے جو اس کی فطرت کے موافق ہو اور انبیاء و ائمہ علیہم السلام کے ذریعہ انسانوں کو عملی زندگی کا نمونہ پیش کرسکے تاکہ وہ اپنے کمال کی منزلوں کو طے کر سکیں اور نہایت میں سعادتمند ہو سکیں۔

امام خمینیؒ

اسلامی انقلاب نے دنیا میں دین کو معیار قرار دیتے ہوئے ایک نئے نظام کی بنیاد قائم کی۔ اس ہدف کو پورا کرنے کے لئے اسلامی انقلاب نے دو بنیادی راستے انتخاب کئے: پہلا قلیل مدتی منصوبہ اور وہ یہ کہ موجودہ دنیا میں قائم مغربی نظام سے اسلامی انقلاب کیونکر اور کیسے مقابلہ کرے؟ اس سلسلہ میں اس کی پوری کوشش یہ ہے کہ وہ تمام اقدامات جسے قطب واحد کے محور پر قائم حکومتوں کے ماننے والے، اقوام متحدہ کے پرچم تلے انجام دیتے ہیں، مستقبل میں ایک جدید نظام قائم کرنے کے لئے ان کو روکا جائے اور نئے نظام کی بنیادوں کو مستحکم کیا جائے۔ دوسرا طویل مدتی منصوبہ اور وہ یہ کہ اسلامی انقلاب نے مغربی گلوبلائزیشن سے مقابلہ کے لئے دراز مدت پروگرام کی تیاری کی ہے جس میں ایک دینی اور اسلامی نظام کو محور قرار دیا گیا ہے[۱]۔

مذکورہ دونوں راستے اس وقت اسلامی جمہوریہ ایران میں پوری طرح سے متجلی ہیں بلکہ یہ کہنا مناسب ہے کہ اسلامی جمہوریہ ایک مطلوب اسلامی نظام کے قیام کا مقدمہ ہے جسے مستضعفین کا نظام کہا جاسکتا ہے۔ اسی لئے اس کی بعض خصوصیات مطلوب اسلامی نظام سے قدرے متفاوت ہے اور دوسری طرف اس سے کافی شباہت بھی رکھتا ہے، اور جو فرق قابل مشاہدہ ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں امام معصوم علیہ السلام ظاہری طور پر موجود نہیں ہے اور موجودہ نظام، شدت سے عالمی نظام حکومت سے برسرپیکار ہے۔ بہر حال اس نظام کی ان خصوصیات کا مطالعہ کرنا بہت اچھا ہوگا جن کی بنیاد پر مستقبل میں امام معصوم علیہ السلام کی قیادت میں مستضعفین کی حکومت قائم کی جائے گی:

۱. دین اور سیاست کے درمیان رابطہ

---

۱. رحیم کارگر، آیندہ جہان، ص۱۰۰- ۱۰۷۔

اس وقت عالمی سیاست کے میدان میں اسلامی تحریکوں اور نظریوں کا بول بالا ہے کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ دین اور سیاست کا ایک دوسرے سے بہت قریبی رشتہ ہے۔ یہ عقیدہ اسلامی انقلاب کی پیداوار اور عالمی پیمانہ پر دین و سیاست کے ادغام کا نتیجہ ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ اسلامی انقلاب کی کامیابی کے ابتدائی ایام میں امام خمینیؒ نے اسلامی انقلاب کی آفاقیت کو دین و سیاست کے قریبی رشتہ کا مظہر بتایا۔

دینی تعلیمات کی روشنی میں آپؒ کا عقیدہ تھا کہ مستضعفوں کے مستحکم ارادے مستقبل میں پوری دنیا کی قیادت کو اپنے ہاتھوں میں لے لیں گے اور آپ نے دنیا والوں کو بشارت دی کہ خدا کا یہ وعدہ عنقریب محقق ہوگا اور محروم و مستضعف لوگوں کو دولتمندوں اور ثروتمندوں کا مقام ملے گا۔ دین و سیاست ہمیشہ ساتھ ساتھ ہیں اور اس امر کو اسلامی انقلاب کے افکار کی روشنی میں سمجھنا کوئی دشوار نہیں ہے اس لئے کہ قومی اور سیاسی موانع اور مختلف قومیتوں کے مسئلہ سے چشم پوشی کرتے ہوئے، امت اسلامیہ کی تشکیل اسلامی انقلاب کا ایک اہم نعرہ ہے۔ اسلامی انقلاب قرآن اور اسلامی احکام کی پیروی پر تاکید کرتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ انقلاب عالمی پیمانہ پر اسلامی اصول اور قوانین کو نافذ کرنا چاہتا ہے۔ یہ وہی تحریک اور بیداری ہے جسے بعض مغربی دانشور جیسے ہنیز نے ۱۹۹۳ء میں ''مذہب اسلام کی عالمی تجدید حیات'' کا نام دیا[۱]۔

اسلامی انقلاب کے بعد مذہب اور اسلامی سیاست کے درمیان قریبی رشتہ پیدا ہوا جس کی بنا پر امریکا نے اسلام کو عالمی تباہی کا اصلی سبب بتایا اور اس میدان میں سرگرم مسلمان دانشوروں اور علماء کو اسلام اور مغربی نظام کی جنگ کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اسی طرح سابق سوویت یونین بھی اسلامی انقلاب سے متاثر انقلابی اسلام سے روس کو درپیش خطرات سے خوفزدہ تھا، یہاں تک کہ ایک امریکی جائزہ نگار نے اس بیداری کو عالمی انتقاضہ کا نام دیا۔ بہ طور خلاصہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد سیاسی اسلام کا نظریہ معرض وجود میں آیا جس سے تمام مشرقی و مغربی ممالک خوفزدہ ہوگئے اور انہوں نے اسلامی سیاسی تحریکوں کے دشمنوں کی ہر ممکنہ حمایت کی[۲]۔

ایک دوسرا مغربی دانشور ۱۹۹۳ء میں سیاسی اسلام سے مغرب کی گہری دشمنی کا اصلی ذمہ دار اسلامی انقلاب کو ٹھہراتے ہوئے کہتا ہے:

---

۱. یحییٰ فوزی، اندیشہ سیاسی امام خمینیؒ، مبحث دین و سیاست۔

۲. ری کیلی و فیل مارفلیت، جہانی شدن و جہان سوم، مترجم حسن نورائی بیدخت و محمد علی شیخ علیان، ص ۲۶۵، ۲۸۲۔

"اسلامی ممالک جو قدیم الایام سے مغرب کو اپنا رقیب سمجھتے ہیں، امریکی عالمی نظام کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں جس کی بنیاد دین اور سیاست کی جدائی پر قائم ہے، حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم کی نابودی کے بعد مغرب میں اسلام خواہی کے مسئلہ پر توجہ مرکوز کرنا بظاہر اس مغربی دانشور لارونس کا جواب ہے جس نے ۱۹۹۰ء میں انقلاب ایران کو امام خمینیؒ کا کارنامہ قرار دیتے ہوئے، ایرانی اسلام خواہی کی عالمی مقبولیت کو دشوار قرار دیا تھا۔ آج کے دور میں دین اور سیاست کے قریبی رشتہ کو سبھی مذاہب وفرق نے مان لیا ہے اور یہ بات لوگوں کے دل ودماغ میں رچ بس گئی ہے۔ مثال کے طور پر جنوبی امریکا میں الہیات تحریک اور عالم اسلام میں حماس اور حزب اللہ جیسی تحریکیں[۱]۔

۲. دین خواہی کی ترویج و تبلیغ

اسلامی انقلاب نے جہاں دین و سیاست کو متحد کرنے کی کوشش کی وہیں انسانی سماج کی سب سے بڑی ضرورت یعنی دین خواہی اور دین داری کی بھرپور تبلیغ کی اور اس میدان میں تاثیر گذار اقدامات انجام دیئے، جب بیسویں صدی میں مغربی عیسائیت کی دنیا سے جنم لینے والے سیکولرآئیڈیالوجی نے کمیونزم اور فاشیزم کو جنم دیا تو فاشیزم کی (۱۹۴۵ء میں) شکست اور کمیونزم کی (۱۹۹۱ء میں) تباہی کے بعد لیبرل جمہوریت میدان سیاست کی تنہا شہسوار بے رقیب ہوچکی تھی لیکن جب اسلامی انقلاب وجود میں آیا تو اس نے لیبرل جمہوریت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور یہ انقلاب اس کے لئے بہت بڑا چیلنج بن گیا، اس لئے کہ اس نے ان تمام لیبرل دانشوروں کے نظریات پر خط بطلان کھینچ دیا جو یہ کہہ رہے تھے کہ انسانی سماج ماڈرن ہونے کے بعد بے دین ہوجائے گا اور دین رفتہ رفتہ اپنی سیاسی اور اجتماعی پوزیشن کھو بیٹھے گا، یا یوں کہا جائے کہ ایک زمانے تک یہ فکر عام تھی کہ دنیا کی قومیں ماڈرن ہوتے ہوئے خود بخود سیکولر ہوجائیں گی لیکن اسلامی انقلاب نے دنیا والوں کے سامنے ایک مختلف نظریہ پیش کیا اور وہ یہ کہ جو سماج دین کی طرف مائل ہوتا ہے وہ ماڈرن ہونے کے بعد سیکولر نہیں ہوتا، اسی وجہ سے ترقی یافتہ اور ترقی کی راہ پر گامزن ممالک میں لوگوں کا یہ عقیدہ بن گیا ہے کہ وہ دینی تحریکوں میں حصہ لے کر اپنے مادی اور معنوی منافع کو بہتر انداز میں حاصل کرسکتے ہیں۔

---

۱. ایضاً۔

جنگ سرد کے خاتمہ کے بعد ٹلگرام، ٹیلیفون، انٹرنٹ، فیکس اور ایمیل جیسی سہولیات کی وجہ سے دینی اور غیر دینی معاشروں اور سیاسی و مذہبی رہنماؤں کے آپسی تعلقات اور تعاون بڑھنے لگے اور اس کے نتیجہ میں اسلامی انقلاب کے دینی اقدار عام ہونے لگے۔

بہر حال اس وقت دین پوری دنیا میں ایک مؤثر اور تسلیم شدہ طاقت کے عنوان سے پہچانا جاتا ہے، اس کی سب سے اہم اور روشن مثال کو دینی بنیاد پرستی کی شکل میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ دینی بنیاد پرستی ایک قسم کی حکمت عملی کا نام ہے جس میں کوشش کی جاتی ہے کہ دینداروں کی شناخت کی ان لوگوں کے مقابلے میں حفاظت کی جائے جو انہیں بے دین بنادینا چاہتے ہیں۔ بعض اوقات اس کی دفاعی حالت، بدل بھی جایا کرتی ہے اور سیاسی حملے کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ البتہ یہاں دوبارہ اس نکتہ پر زور دینا ضروری ہے کہ عالمی سیاست میں ایک اصل کے عنوان سے دین کی حیات نو یا دینی بنیاد پرستی کا احیاء کمیونزم کی تباہی سے زیادہ اسلامی انقلاب کی کامیابی سے مربوط ہے، اسی وجہ سے ۱۹۹۰ء میں خلیج فارس کی جنگ اور ۲۰۰۳ء میں عراق پر حملہ، حقیقت میں اسلامی انقلاب سے متاثر دینی بنیاد پرستی یا دین خواہی پر مبنی تحریکوں کو کچلنے کے لئے انجام دیا گیا تھا[۱]۔

۳. عوام کی دیکھ بھال

ایران کے اسلامی انقلاب کی سب سے بڑی خاصیت اور امتیاز اس کا عوامی ہونا ہے، اس نے دنیا کی مختلف تحریکوں اور سیاسی پارٹیوں میں اپنا مقام بنالیا ہے اور دنیا میں مستضعفین کی حکومت میں عوام کی کارکردگی کو بہترین انداز میں پیش کردیا ہے، اگر لفظوں کو بدل کر کہوں تو یہ کہنا بہتر ہوگا کہ مختلف تحریکوں اور سیاسی پارٹیوں نیز عوام کو یہ یقین ہوگیا ہے کہ اسلام میں عوام کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کی طاقت ہے، جس کی بناپر وہ تعلیم یافتہ لوگوں پر بھروسہ کرنے سے زیادہ عوام پر بھروسہ کرنے لگے ہیں، اور انہوں نے عوام سے اپنے روابط مضبوط اور وسیع کردیئے ہیں، سویڈن کے تحریک اسلامی کے سربراہ ڈاکٹر حسن ترابی کے بقول ایران کا اسلامی انقلاب، عوامی فکر و نظر اور عوامی طاقت کو اسلامی دعوت کی راہ میں استعمال کا نتیجہ ہے، عوامی سرگرمی اور کارکردگی نے اسلامی تحریکوں کو قوم و مذہب کے نام پر یکجہتی کی جانب گامزن کردیا، یہ وہ عنصر

---

۱. ژیل کیل، ارادہ خداوند، یہودیا، مسیحیان و مسلمانان در راہ تسخیر دوبارہ جہان، مترجم عباس آگاہی، ص ۳۰۔

تھا جس نے اسلامی اور سیاسی تحریکوں کو اختلاف، تفرقہ اور لڑائی جھگڑے سے قدرے دور کر دیا اور انہیں ایک منظّم، مضبوط، امکانات سے بھرپور، پائدار اور وسیع پیمانہ پر حمایتوں اور صلاحیتوں کا اہل بنا دیا ہے[۱]۔

عوام کی جانب سے سیاسی تحریکوں کو اہمیت دینا اور ان کی طرف رغبت رکھنا جابجا قابل دید ہے بطور مثال ۱۳۵۹ء میں فوجی بغاوت سے پہلے ہی ترکی کے مسلمان عوام سڑکوں پر اتر آئے اور انہوں نے ایک ساتھ مل کر، استقلال، آزادی اور اسلامی جمہوریہ کا نعرہ لگایا، فلسطین کی جہاد اسلامی تنظیم نے وہی نعرے اپنے عوام کو سکھائے جو نعرے اس وقت ایرانی عوام لگا رہے تھے، انہوں نے سڑکوں پر بلند آواز میں نعرے لگائے: ''لا الہ الا اللہ''، ''اللہ اکبر''، ''فتح اسلام کی ہے''، انہوں نے الحادی اور قوم پرستی پر مبنی تمام نعروں کو بھلا دیا اور اسلامی انقلاب کے نعرے لگانے لگے۔ ۱۳۶۹ء سے ۱۳۷۹ء تک جنوبی افریقہ میں ''اللہ اکبر'' کے نعرے بہت سنائی دیتے تھے، اور رہبر انقلاب کا یہ بیان صادق ہے کہ الجیریا کے لوگوں نے گھر کی چھتوں سے ''اللہ اکبر'' کا نعرہ لگانا ایران کے انقلابی عوام سے سیکھا[۲]۔

اسلامی انقلاب نے دنیا کو یہ درس دیا کہ سیاسی نظام کا جواز عوام کی مرضی اور ان کے ووٹ سے حاصل ہوتا ہے اسی بنیاد پر اسلامی جمہوریہ کے نفاذ کو لوگوں کی مرضی اور ان کے ووٹ سے طے کیا گیا۔ ایک نظام کو نافذ کرنے کے لئے عوام کی مرضی کو لینا نہ تنہا ایک شجاعانہ اور حیرت انگیز اقدام تھا بلکہ مغربی جمہوریت سے کہیں بالاتر فکر تھی، اس فکر کے بے بدیل ہونے کی بنا پر اسے لیبرل جمہوریت سے خستہ عوام کے لئے بہترین متبادل قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایسے نظام اور انقلاب میں عوام، دانشوروں کو انتخاب کرتے ہیں تاکہ ان کی نظارت میں عوام کے حق میں قوانین بنائے جائیں، اور جب قوانین کا مسودہ تیار ہو جائے تو اسے عوام کے سامنے پیش کیا جائے، ایران میں جنگ کا سایہ منڈلانے کے باوجود حضرت امام راحلؒ نے ایران کے سب سے پہلے صدر جمہوریہ کی تحریک عدم اعتماد کے لئے ہر گز کسی کو یہ اجازت نہیں دی کہ وہ جنگی حالات کے پیش نظر اسے نظر انداز کرے۔ اور یہ بھی کسی کو اجازت نہیں دی کہ الیکشن کا پیسہ جنگ کی ضرورت کے پیش نظر جنگی امور میں خرچ کر دیا جائے اور مسلسل یہ تاکید کرتے رہے کہ پارلیمنٹ کے اعضا کا چناؤ، مجلس خبرگان اور صدارتی انتخابات میں ایک دن کی بھی تاخیر نہ کی جائے[۳]۔

---

۱. حسین کرہرودی، انتفاضہ فلسطین، مولود اصول گرایی اسلامی معاصر، فصلنامہ علوم سیاسی، ش ۱۴، تابستان، ۱۳۸۰، ص ۱۹۹، ۲۱۰۔

۲. محمد حسین جمشیدی، ارتباط متقابل انقلاب اسلامی ایران و جنبش شیعیان عراق، مجموعہ مقالات انقلاب اسلامی و ریشہ ہای آن، ج ۲، ص ۳۹۱، ۳۹۴۔

۳. کوثر، ج ۱، ص ۳۱۶، و ۸۳۱، ج ۲، ص ۳۱۲۔

۴. اسلامی حجاب

اسلامی حجاب، معنویت سے خالی دنیا کے لئے ایک انمول تحفہ تھا جسے اسلامی انقلاب نے دنیا والوں کے سامنے پیش کیا، اور ہمیں یقین ہے کہ جب دنیا میں مستضعفین کی حکومت قائم ہوگی تو وہ اسلامی حجاب کے عملی نمونے پیش کرے گی، لیکن اس سے قبل اس اسلامی انقلاب کا یہ قدم دو اہم اثرات کا حامل ہے:

الف: دنیا والوں کو معلوم ہو چکا ہے کہ ایک مسلمان عورت صرف گھریلو کاموں کے لئے نہیں ہوتی ہے۔ محترمہ ڈانیل کشار اس سلسلہ میں کہتی ہیں: ''بڑے افسوس کا مقام ہے کہ غیر ایرانی سماج، ایران میں عورتوں کے سلسلہ میں منفی نظریات کا حامل ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ ان کی سرگرمیاں بہت محدود ہیں، صرف گھروں میں رہتی ہیں اور گھر کی دیکھ ریکھ کرتی ہیں''[1]۔

ب: اس دور میں مسلمان خواتین کے سلسلہ میں نظریات قدرے بدل چکے ہیں، نیویارک ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق: جاپان کی دارالحکومت ٹوکن میں منعقد ہونے والی عالمی کانفرنس میں خواتین کے اسلامی حقوق کی بازیابی پر مبنی تحریک کی پیشکش ایک عجیب اتفاق ہے۔ اس لئے کہ عالم اسلام سے مدعو ہونے والے مقررین، خواتین کے نام اہم پیغامات لائے تھے۔ انہیں لوگوں کے درمیان ایک ایرانی باحجاب خاتون تھیں اور یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ ایسی کانفرنسوں میں مسلمان خواتین کی شرکت بہت موثر رہی ہے۔ اسی طرح امریکی مسلمان خاتون ہانیہ ترکیان نے دنیا والوں کے سامنے ''مسلمان عورت'' کے موضوع پر ایک ایرانی باحجاب خاتون کی تقریر کو بہت سراہا ہے، جیسا کہ احمد ہوبر کہتے ہیں: اس وقت ایران میں خواتین کو جو آزادی ملی ہے، اس نے پوری دنیا والوں کو متاثر کیا ہے۔

اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد اسلامی حجاب کا جو نمونہ ایران نے پیش کیا اس سے اسلامی دنیا زیادہ متاثر نظر آتی ہے، جیسا کہ لیز مارکوس معترف ہے کہ جب سے ایرانی میڈیا نے باحجاب خواتین کو دنیا والوں کے سامنے پیش کیا ہے، انڈونیشیا میں خواتین کا رجحان، باحجاب رہنے کے لئے بہت زیادہ ہو گیا ہے بلکہ انڈونیشیا میں ایرانی حجاب پسندیدہ ہے اور نئی نسل کے لئے فیشن کی شکل اختیار کر چکا ہے اور علمی مراکز اور کالجوں میں اس کی حمایت کرنے والے بڑھتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ترک خواتین بھی ایرانی حجاب کو پسند کرتی ہیں۔ اسی طرح بعض خلیجی ممالک میں مسلمان خواتین میں ایرانی حجاب مخصوصا اسکارف پسند کیا جانے لگا ہے۔ اردن کے کالجوں اور یونیورسٹی میں باحجاب لڑکیوں کی تعداد بڑھ چکی ہے اور لیبیا میں بھی

---

۱. معصومہ عسکری، انقلاب اسلامی وارائہ الگوی مطلوب از زن مسلمان، ویژہ نامہ ماہ نامہ پیام زن، دفتر سوم، فروردین ۱۳۸۴، ص ۹۶۔

حجاب کی طرف رجحان بہت زیادہ ہو گیا ہے، پس اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایرانی حجاب دنیا کی تمام خواتین مخصوصاً مسلمان خواتین کے لئے نمونہ بن چکا ہے[۱]۔

اسلامی جمہوریہ ایران کی خواتین کا پردہ مختلف شکل و صورت میں دنیا کے گوشہ و کنار میں مختلف ذرائع کے سہارے نہ صرف یہ کہ عام ہو چکا ہے، بلکہ لوگوں کی زندگی کا حصہ بنتا جارہا ہے اور ان ذرائع میں سے ایک فیلم ہے جس کے ذریعہ اس حجاب کو دنیا میں عام کیا گیا ہے، اگر حجاب کے عام ہونے کا جائزہ لیا جائے تو درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

الف: اسلامی حجاب، حقیقت میں خواتین کی فردی اور مذہبی شخصیت کو ظاہر کرتا ہے۔

ب: حجاب کو اہمیت دینا، بے لگام تحریک نسواں کو روکنا ہے۔

ج: اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کی وجہ سے لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔

۵. الٰہی حکومت کی طرف رجحان

اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ایران میں جو اسلامی نظام قائم ہوا وہ دنیا کے تمام آزادی خواہ مسلمانوں کے لئے ایک منفرد نمونہ بن گیا، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسلامی جمہوریہ ایران کی شکل میں دوسرے ملکوں میں ایک اسلامی نظام کا قیام دنیا میں مستضعفین کی عالمی حکومت کے لئے مقدمات کو بہترین انداز میں فراہم کر سکتا ہے، مجلس اعلائے انقلاب اسلامی عراق کے ایک سربراہ اپنی تقریر میں کہتے ہیں:

> ''جب ایران میں اسلامی انقلاب کامیابی سے ہمکنار ہوا تو اس وقت ہم لوگ کہتے تھے اسلام کامیاب ہوا ہے اور عراق میں بھی انشاء اللہ کامیاب ہوگا، لہٰذا ہمیں اس انقلاب سے درس لینا چاہئے اور اسے اپنے لئے سر مشق قرار دینا چاہئے''[۲]۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے: اسلامی انقلاب نے تمام مسلمانوں کے وجود میں انقلابی روح پھونک دی اور انہیں زمین پر خلافت الٰہیہ کے قیام کے لئے آگے بڑھا دیا اسی لئے آج دنیا کی تمام انقلابی اور اسلامی تحریکوں کے دستور العمل میں یہ بات نظر آتی ہے۔

مسلمان سیاسی قائدین کا اسلامی حکومتوں کے قیام کا خواہاں ہونا اس وقت مختلف شکل و صورت میں جابجا دیکھا جاسکتا ہے جیسا کہ بعض اسلامی تحریکوں (الیسار الاسلامی مصر) نے امام خمینیؒ کی کتاب ''حکومت

---

۱. محبوبہ پلنگی، زنان ایرانی از نگاہ زنان غیر ایرانی، گذری کوتاہ، ویژہ نامہ ماہ نامہ، پیام زن، دفتر سوم، فروردین ۱۳۸۴، ص۱۸۶، ۱۹۱۔

۲. ارتباط متقابل انقلاب اسلامی ایران و جنبش شیعیان عراق، ص۳۹۱، ۳۹۴۔

اسلامی'' کے ترجمے کے ذریعہ اسلامی جمہوریہ ایران کو عالمی نظام کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے پیش کیا ہے، اسی طرح الجزیرہ کی اسلامی تحریک نجات اسلامی نے اسے منفرد راہ حل کے عنوان سے دنیا والوں کے سامنے پیش کیا ہے، عراق اور ایران کے مابین جنگ کی شروعات سے پہلے آیۃ اللہ شہید صدرؒ نے اسلامی جمہوریہ ایران کی طرح ولایت فقیہ کی بنیاد پر عراق میں ایک اسلامی حکومت قائم کرنے کی بہت کوشش کی[۱]۔ کی[۱]۔

بعض دیگر اسلامی تحریکیں ولایت فقیہ کے معیار کو قبول کرنے کے بعد عالم اسلام کے رہبر حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی کی اتباع کرتی ہیں۔اس قسم کی تحریکیں دو طرح کی ہیں: ایک وہ تحریک جو رہبر معظم کی اتباع عقیدت اور مذہبی جذبہ کی بنا پر کرتی ہے جیسے کہ لبنان کی ''تحریک امل'' اور دوسری وہ تحریک ہے جو مذہبی اور سیاسی دونوں اعتبار سے رہبر کی پیروکار ہے جیسے لبنان کی ''تحریک حزب اللہ''[۲]۔

ایسی تمام اسلامی تحریکیں ایک اسلامی نظام کے قیام کے لئے مختلف طور طریقے اپنائے ہوئے ہیں جن میں سے بعض ایسی تحریکیں ہیں جنہوں نے مسلحانہ اقدامات انجام دئے جن میں سے ایک حزب اللہ حجاز ہے یا بحرین کی تحریک آزادی ہے جنہوں نے حکومت وقت کا تختہ الٹنے کے لئے سخت رویہ اپنایا، لیکن بعض ایسی تحریکیں ہیں جو موجودہ دور میں مسلحانہ اور سخت رویہ اپنانے کو مناسب نہیں سمجھتیں بلکہ پر امن طریقے سے مسائل ومشکلات کا حل نکالنا چاہتی ہیں۔ مثال کے طور پر پارلیمنٹ کے الیکشن کے ذریعہ حکومت وقت کو بدل دینا چاہتی ہیں جیسے ترکی کی تحریک رفاہ، اسی طرح کچھ تحریکیں مذکورہ دونوں طور طریقے اپنائے ہوئے ہیں جیسے کہ لبنان کی تحریک حزب اللہ جو اسلامی حکومت کے قیام کے لئے جہاں اسرائیل کے مدمقابل ہے وہیں الیکشن کے ذریعہ، حکومت وقت کو اپنے اعتماد میں لئے ہوئے ہے[۳]۔

۶. آئین میں تبدیلی

اسلامی انقلاب نے اپنے قیام کے بعد دنیا میں رائج بیشتر اقدار اور روایتوں میں تبدیلی کی اور ان کی جگہ پر نئے اقدار قائم کئے جسے ہم یہاں پر بیان کریں گے:

---

۱. حمید احمدی، انقلاب اسلامی و جنبش ھای اسلامی در خاور میانہ، مجموعہ مقالات پیرامون جہان سوم، ص۱۱۷، ۱۵۶۔
۲. دست آوردہای عظیم انقلاب شکوہ مند اسلامی در گسترہ جہان، ص۳، ۴۷۔
۳. دست آوردہای عظیم انقلاب شکوہ مند اسلامی در گسترہ جہان، ص۳، ۴۷۔

الف: عام طور پر مانا جاتا ہے کہ روایتی معاشرے کو ماڈرن معاشرہ بنانے کے لئے ترقی کے عالمی نمونوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا اور وہ بھی ایسے نمونے جو مغربی دنیا سے متاثر ہوں۔ یعنی غیر مغربی دنیا کو ترقی کی منزلیں طے کرنے کے لئے یوروپ اور امریکا کے نقش قدم پر چلنا ہوگا، یعنی اس نظریہ کے مطابق سماجی ارتقا دنیا پرستی سے وابستہ ہے، لیکن اسلامی انقلاب نے مغربی ترقی کے اصول اور مبانی پر اعتراض جتاتے ہوئے سوال اٹھایا اور اپنا موقف بھی واضح کیا کہ دنیا کو چلانے کے لئے دین بہترین اور بنیادی اصول کا حامل ہے اور دنیا پرستی کا شدت سے مخالف بھی ہے، اس طرح اسلامی انقلاب نے دنیا میں ترقی کے اصول و مبانی کو بدل ڈالا اور یہ بات واضح کردی کہ سماجی ترقی کے لئے بشر کو مغربی اصول اپنانے کی ضرورت نہیں ہے[۱]۔

ب: اسلامی انقلاب ایک ایسے دور میں رونما ہوا جب اس صدی کے آخری پچیس سالوں میں مابعد جدیدیت ایک نئے مرحلے میں داخل ہوچکا تھا۔ اسی بناپر بے شمار مغربی دانشوروں کی رائے کے مطابق اسلامی انقلاب حقیقت میں مابعد جدیدیت ہے اور اسے جدیدیت میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، اسی خاصہ کی بناپر میشل فوکو، ڈریڈا اور اڈوارڈ سعید نے اسے اپنی توجہات کا مرکز بنایا، فوکو ایک ایسا دانشور ہے جس نے اسلامی انقلاب کے سلسلہ میں جدید نظریات قائم کئے اور اپنے بیانات اور مقالات کے ذریعہ اسلامی انقلاب ایران اور ایرانی عوام کی بھرپور حمایت کی اگرچہ اس اقدام کی بناپر اسے خود اپنے نزدیکی دانشوروں سے طعن و تشنیع سننے پڑے۔ اس کی نظر میں اسلامی انقلاب ایران سیاسی معنوی ہے جب کہ مغربی سرزمین پر معنویت صدیوں سے عنقا ہوچکی تھی، اس طرح اسلامی انقلاب نے اپنے اصول کے ذریعہ معنویت سے خالی زندگی اور ترقی کی نفی کردی اور دنیاوالوں کے سامنے نت نئے اقدار رکھے جس میں مادی اور معنوی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے[۲]۔

ج: اسلامی انقلاب ایران کے قیام سے پہلے تمام انقلابی نظریہ پرداز سماجیات سے متعلق موجودہ صورت حال کے حامی تھے؛ یعنی انہوں نے یہ کوشش کی کہ مختلف انقلابات کے مطالعہ کے ذریعہ ایک نظریہ قائم کریں اور پھر دنیا میں کہیں بھی کوئی انقلاب رونما ہو، اس کی توجیہ و تفسیر یا اس کے ظہور کی پیشین گوئی اس نظریہ کے ذریعہ کریں۔ محترمہ اسکاچپول بھی انہیں دانشوروں میں سے ایک ہیں جن کی نظر میں ایک انقلاب، ایک اتفاق ہے اور ارادہ کے اختیار سے باہر ہے۔ ان کا عقیدہ تھا: انقلاب

---

۱. فرامرز، رفیع پور، توسعہ و تضاد، ص ۱۲، ۱۳۔
۲. فرامرز، رفیع پور، توسعہ و تضاد، ص ۱۲، ۱۳۔

آتا ہے، اسے لایا نہیں جاتا۔ جب اسلامی انقلاب رونما ہوا جس کو لایا گیا تھا اور اس کو کامیاب بنایا گیا تھا تو اس کے بعد انہوں نے اپنا نظریہ بدل ڈالا اور کہا: انقلاب آتے ہیں لائے نہیں جاتے سوائے اسلامی انقلاب ایران کے جو لایا گیا ہے۔ اس طرح اسلامی انقلاب ایران نے دنیا کے نظریہ پردازوں کے سامنے ایک نیا باب کھول دیا[۱]۔

اسلامی انقلاب ایران نے موجودہ نظام کے اصول و مبانی کو توڑ کر، معنویت کی تشنہ دنیا کو فطرت الٰہی پر قائم، حکومت الٰہی کو قبول کرنے کی راہ میں ایک موثر قدم اٹھایا۔

۷. استکبار سے جنگ

دنیا میں ہمیشہ سے ظالموں اور مستکبروں کی حکومت رہی ہے۔ حقیقت میں ایسے ہی نظام کی کمر توڑ کر دنیا میں امام زمانہ (عج) کی حکومت کے قیام کے مقدمات کو فراہم کرنا اسلامی انقلاب ایران کا مقصد ہے۔ اسلامی انقلاب ایران نے استقلال کو ترقی کا اہم راز اور وابستگی کو پچھڑے رہنے کا سب سے بڑا سبب بتایا ہے اور اس سلسلہ میں متعدد بار دنیائے اسلام اور پچھڑے ہوئے ممالک کو آگاہ بھی کیا ہے، امام خمینیؒ کا عقیدہ تھا "اسلام، صنعت، زراعت، اقتصاد اور تہذیب میں کسی سے بالخصوص اغیار سے وابستہ رہنے کا شدت سے مخالف ہے"، اسی طرح آپؒ کی نظر میں فکری وابستگی بھی زیانبار ہے، اور ہمیشہ اس بات کی تاکید کی کہ وابستگی اور استقلال ہر گز جمع نہیں ہو سکتے اور جب تک سماج کے ہر شعبہ اور ہر فرد میں استقلال پیدا نہیں ہوتا اس وقت تک اس ملک کو آزاد اور مستقل نہیں کہا جا سکتا[۲]۔

امام خمینی (رہ) کی کوششوں سے ایران، امریکا کے سلطہ سے آزاد ہوا جس کی وجہ سے دوسری قوموں میں ظالموں کے مقابلہ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور معنوی والہی اقدار کا بول بالا ہوا۔

مقام معظم رہبری حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی کی نظر میں اسلامی انقلاب کا استقلال خواہ ہونا دنیا کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکا، یہاں تک کہ بعض عقب ماندہ ممالک کے سربراہوں کو اس امر کا اعتراف کرنا پڑا۔ جیسا کہ اسلامی ممالک کے سربراہوں پر مشتمل کانفرنس میں مشرقی ایشیاء سے تعلق رکھنے والے ایک اسلامی ملک کے سربراہ نے رہبر معظم کو مخاطب کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ اس کے ملک کی فقیری حقیقت میں اسرائیلی اور امریکی سرمایہ داروں اور تجار سے وابستگی کی بنا پر ہے۔ اسی لئے رہبر معظم

---

۱. عبدالوہاب فراتی، رہ یافت ہای نظری بر انقلاب اسلامی، ص ۱۸۴، ۲۱۵۔

۲. صحیفہ نور، ج ۱، ص ۱۰۹۔

کا عقیدہ ہے کہ جب عالمی استکبار واستعمار اپنے منافع کو خطرہ میں دیکھتا ہے تو پھر وہ کسی بھی قوم و ملت اور معیشت و فرہنگ پر رحم نہیں کرتا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ونزوئلا کی حکومت اور عوام کا امریکہ کے سامنے ڈٹے رہنا یقیناً اسلامی انقلاب سے متاثر ہونے اور درس لینے کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح کاسٹرو بھی ایران کے انقلاب کو نمونہ قرار دیتے ہوئے عوام کی حمایت کے سہارے ایک عرصہ تک امریکہ کے سامنے قد علم کئے ہوئے تھا۔ لبنان کے حزب اللہ بھی ایرانی عوام سے سبق لیتے ہوئے اسرائیل کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے ہیں اور اپنے استقلال کو محفوظ کئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح سیریا کے حکمرانوں نے بارہا اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ آج ان کی ثبات قدمی، جوانمردی اور استقامت اسلامی جمہوریہ ایران کی مرہون منت ہے۔ ایران کا سیاسی، اقتصادی، فرہنگی اور دیگر شعبہ ہای حیات میں مستقل ہونا دنیا کے مجاہدوں کے لئے نمونہ عمل بن چکا ہے۔ آج عراق، سویڈن، فلسطین وغیرہ اپنے آب وخاک پر قابض ظالموں کے خلاف محاذ قائم کئے ہوئے ہیں اور عجیب بات تو یہ ہے کہ یہ تمام مسلح تحریکیں ایرانی نعرہ ''مرگ بر امریکا'' (امریکہ مردہ باد)، ایرانی طریق کار یعنی عوامی بسیج اور اسلامی انقلاب کے اصول یعنی خدا پر بھروسہ کے ذریعہ اپنی تحریک کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے عالمی استکبار واستبداد اور سامراج خوفزدہ ہے کہ کہیں اسلامی انقلاب جیسا کوئی دوسرا انقلاب رونما نہ ہو جائے[۱]۔

اس وقت بطور کلی یہ نتیجہ برآمد کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی جمہوریہ ایران نے پوری دنیا میں انسانی اقدار جیسے بیداری، حجاب، دین و سیاست کا باہمی رشتہ اور دیگر اقدار کے ذریعہ جہاد اور اسلامی حکومت کے قیام کا بہترین دستور العمل پیش کر دیا ہے۔ اس راہ میں اسلامی انقلاب کو مسلحانہ کارروائی کی بہت زیادہ ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی اقدار چونکہ انسانی فطرت سے ہم آہنگ اور اس کی ضرورت ہیں لہٰذا انہیں فعال و متحرک کرنے کے لئے کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ انہیں صرف زندہ کرنے کی ضرورت ہے، البتہ اسلامی انقلاب کے دامن سے جنم لینے والے اقدار اسلامی ممالک میں زیادہ مؤثر واقع ہوئے۔

اسلامی انقلاب دینی اقدار کے سہارے کامیابی سے ہمکنار ہوا ہے اور پھر اس نے اس کا پاس و لحاظ کرتے ہوئے پوری دنیا میں اسے عام کیا اس لئے کہ یہ اقدار جس حد تک عام ہوں گے اسلامی انقلاب کی عمر اتنی ہی طویل ہوتی جائے گی، اور اس طرح عالمی حکومت کے مقدمات بآسانی فراہم ہوتے رہیں گے۔

۱۔ ایوور بنسون، ایران: نگاہی بہ انقلاب اسلامی، ترجمہ: وحید رضا نعیمی، مجلّہ ہمشہری دیپلماتیک، نیمہ دوم بہمن، ۱۳۸۲، ص ۱۲۔

امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف

مستضعفین کی حکومت، حقیقت میں وحی، بعثت انبیا اور امامت اولیا کا ثمرہ ہے جس کی تائید انسانی فطرت اور عقل کرتی ہے، یہ عالمی حکومت پوری دنیا میں اسلامی تہذیب کے عام ہونے کی خوشخبری دے رہی ہے۔ اس عالمی حکومت کی اہم خصوصیات ملاحظہ ہوں:

۱. توحیدی فطرت

ایک انسان کو دائرہ اسلام میں آنے کے لئے موحد ہونا اور خدا کی وحدانیت پر ایمان لانا واجب ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن کریم نے زیادہ تر جو تعبیر استعمال کی ہے وہ "لا الہ الا اللہ" (صافات، ۳۴) "لا الہ الا ھو" (بقرہ، ۱۶۳) اور "لا الہ الا" (نحل، ۲) ہے۔ وحدانیت مخلوقات عالم کے درمیان وہ واحد نقطہ اشتراک ہے جہاں سب جمع ہوسکتے ہیں اور مستضعفین کی عالمی حکومت کے حصہ دار بن سکتے ہیں۔ اسی لئے خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے:

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفاً فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (روم، ۳۰)

ترجمہ: اپنے رخ کو دین کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارہ کش رہیں کہ یہ دین وہ فطرت الہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور خلقت الہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی ہے۔ یقیناً یہی سیدھا اور مستحکم دین ہے مگر لوگوں کی اکثریت اس بات سے بالکل بے خبر ہے۔

۲. عاقبت اندیشی

عاقبت اندیشی یعنی انجام کی تلاش اور آخرت پر ایمان جسے اسلامی مفاہیم میں معاد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسلام نے معاد پر بڑی تاکید کی ہے اس لئے کہ عالمی نظام کو کامیاب بنانے کے لئے اس عقیدہ کو انسانوں کے ذہن میں بٹھانا بہت مؤثر ہے۔ یہ عقیدہ سماجی برتاؤ پر اثرانداز ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ (مومنون، ۱۱۵)

ترجمہ: کیا تمہارا خیال یہ تھا کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف پلٹ کر نہیں لائے جاؤ گے۔

۳. انسانی عزت و وقار

خداوند عالم نے انسانوں کو کرامت اور بزرگی عطا کی ہے جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (اسرا،۷۰) ترجمہ: اور ہم نے بنی آدم کو کرامت عطا کی۔

دین کی نظر میں انسان، جہاں مادی مخلوق ہے وہیں رحمانی مخلوق بھی ہے، اسی وجہ سے مستضعفین کی عالمی حکومت اور مغربی عالمی نظام کے درمیان کہ جس میں انسانوں پر مسلط ہونا بنیادی عنصر ہے، ایک بنیادی فرق ہے۔ اسلامی نظام میں انسانوں کو کرامت اور بزرگی عطا کی جاتی ہے اور اسے اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ دین کے آئینہ میں مستقل اور آزاد زندگی گذارے اور اسلام ہر گزان پر عقیدہ کے اعتبار سے جبر نہیں کرنا چاہتا۔ مذکورہ بیان کئے گئے عالمی اسلامی نظام کے تین اصول کی بنیاد پر اسلامی حکومت کے درج ذیل تین منصوبہ ہیں:

الف: انسانوں کے درمیان ایمان اور عقیدہ کی بنیاد پر درجہ بندی ہوتی ہے نہ کہ خون اور نسل و رنگ کی بنیاد پر۔

ب: بنیادی طور پر کسی پر مسلط ہونا یا کسی دوسرے کو اپنے اوپر مسلط ہونے کی اجازت دینا غلط ہے۔

ج: تمام انسانوں کے درمیان مساوات قائم کرنا خواہ وہ مسلمان ہوں یا کافر۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ اصول ہیں جو صرف اور صرف اسلامی نظام کا حصہ ہیں اور ابھی تک قائم شدہ تمام عالمی نظاموں میں کوئی بھی ایسا نظام نہیں ہے جس میں مذکورہ اصول پائے جاتے ہوں۔

۴. اللہ کی حاکمیت

اس کائنات پر حکومت کرنا صرف اور صرف خدا کا حق ہے۔ حقیقت میں خدا کا ارادہ پوری کائنات پر حکم فرما ہے اور اس کے فیض سے ہی پوری کائنات رواں دواں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے: یہ کائنات اور اس کے جملہ ارکان و عناصر اسی کی قدرت کے زیر اثر ہیں اور اسی نے انسانوں کو تقدیر پر اختیار بخشا ہے اور اسی نے انسانوں کو انسانی سماج کی دیکھ ریکھ کا ذمہ دار بنایا ہے، اسی خدا نے انسانی سماج کی دیکھ ریکھ کو انسانوں کے سپرد کرتے ہوئے اسے اپنے ارادہ کی تجلی گاہ بنادیا ہے، یعنی اس زمین پر خدا کی حاکمیت اس کے منتخب بندوں کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتی ہے، ایسے نظام میں عقلانیت، معنویت اور عدالت کی حکمرانی انسانی سماج کو کمال کی جانب گامزن کرتی ہے۔

۵. خلیفۃ اللہ

اسلام کے عالمی نظام کی سب سے بڑی خصوصیت امامت و رہبری ہے جس کے لئے انسانوں کا انتخاب ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"و خلف فیکم ما خلفت الانبیاء فی اممها اذ لم یترکوهم هملا بغیر طریق واضح ولا علم قائم"[1]۔

ترجمہ: اس نے بھی گذشتہ نبیوں کی طرح تمہارے درمیان ایک میراث چھوڑی، انبیائے ماسبق نے اپنی امت کو روشن راستے اور معین نشانیاں دکھائے بغیر نہیں چھوڑا اور انہیں تاریکی میں قرار نہیں دیا۔

امامت و رہبری میں مذکورہ خصوصیت کے علاوہ اور بھی خصوصیات ہیں جو اجتماعی یکجہتی اور وحدت کا باعث ہیں اس لئے کہ اس نے انسانوں کی معنوی اور سیاسی قیادت کا ذمہ لیا ہے جو اجتماعی نظم و انضباط کا بنیادی عنصر ہے، اسے لوگوں کی بیعت سے مشروعیت حاصل ہوتی ہے اور حقیقت میں وہ افرادی واجتماعی اعتبار سے مکمل نمونہ ہے، اسی طرح عالمی اسلامی نظام میں امامت و رہبری نظریاتی محور بھی ہے۔

۶. ملت واحدہ

عالمی اسلامی نظام یا مستضعفین کی عالمی حکومت میں انسان، عقلی اور معنوی اعتبار سے مرحلہ بلوغ بلکہ ترقی کی انتہائی منزلوں کو طے کرے گا اور بالفعل تمام انسانی اقدار و فضائل کا مالک بن جائے گا، عالمی اسلامی نظام حقیقت میں ترقی یافتہ اور تکامل یافتہ ہوگا اور اس کے دائرے میں انسانی اقدار کو نکھرنے کا موقع ملے گا، انسانوں کی تمام فطری ضرورتیں پوری ہوں گی اور عالمی پیمانہ پر صلح اور عدل وانصاف کو عام کرنے کے لئے مختلف ذرائع کا استعمال کیا جائے گا اس لئے کہ خداوند عالم قرآن کریم فرماتا ہے:

وَإِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ (مومنون، ۵۲)

ترجمہ: اور تمہارا سب کا دین ایک دین ہے اور میں ہی سب کا پروردگار ہوں لہٰذا بس مجھ سے ڈرو۔

۷. واحد قانون

حدیث ثقلین سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ دنیوی اور اخروی سعادت و کامیابی حاصل کرنے کے لئے بہترین قانون (خدا کی کتاب قرآن مجید) اور اسے بہترین انداز میں نافذ کرنے والے (اہل بیت پیغمبر علیہم السلام) کی ضرورت ہے۔ بشریت ہمیشہ سے قانون کے ضعف و نقص کی وجہ سے نقصان میں رہی ہے لیکن قوانین کو بہترین انداز میں نافذ کرنے والوں کی کمی زیادہ نقصان دہ رہی ہے۔ جو عالمی نظام اسلامی بنیادوں پر قائم ہوگا اس میں عقل کی کوئی دخالت نہ ہوگی اس لئے کہ اس میں اتنی توانائی نہیں ہے کہ وہ

---

۱. نہج البلاغہ، خطبہ ۱۔

انسان کے جملہ مسائل اور ابعاد کو سمجھ سکے اور اس کا اندازہ لگا سکے بلکہ اس میں شریعت کا قانون ہو گا جسے خالق رب العزت نے بنایا ہے جوانسانوں کی تمام ضروریات سے باخبر ہے، اسی لئے وہ نظام ہر اعتبار سے جامع و کامل ہے اور پوری طرح انسانی فطرت سے ہم آہنگ بھی ہے۔ جب دنیا میں عالمی اسلامی نظام قائم ہو گا اس وقت واقعی معنوں میں اسلامی قوانین جاری ہوں گے اور ہر انسان کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے گا اور ہر شخص کے لئے اس کی استعداد و توانائی کے اعتبار سے حقوق اور فرائض معین کئے جائیں گے۔

۸. عدل و عدالت

عالمی اسلامی نظام میں عدالت عام اور پوری طرح جاری ہو گی، اسی لئے جب کائنات میں عالمی اسلامی نظام قائم ہو گا تو ظلم و جور کا پوری طرح خاتمہ ہو جائے گا اور مساوات کی بنیاد پر نظام قائم ہو گا، اس موضوع پر مشتمل بے شمار حدیثیں اسلامی منابع میں وارد ہوئی ہیں جیسا کہ ایک روایت میں ابوسعید خدری پیغمبر اکرم ﷺ سے نقل کرتے ہیں:

''ابشرکم بالمهدی یملا الارض قسطا کما ملئت جورا و ظلما یرضی عنہ سکان السماء والارض یقسم المال صحاحا فقال رجل ما معنی صحاحا؟ قال بالسویۃ بین الناس و یملا قلوب امۃ محمد غنی و یسعهم عدلہ''[۱]۔

ترجمہ: میں تمہیں مہدی(عج) کی بشارت دیتا ہوں جو زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا جس طرح سے کہ وہ ظلم و جور سے بھری ہو گی، آسمان و زمین پر رہنے والے اس سے راضی ہوں گے، وہ لوگوں کے درمیان مال و دولت کو صحاحا تقسیم کرے گا، ایک شخص نے سوال کیا: یا رسول اللہ ﷺ صحاحا کا مطلب کیا ہے؟ فرمایا: یعنی وہ لوگوں کے درمیان مال و دولت کو برابر سے تقسیم کرے گا اور امت محمدیؐ کے دلوں کو مالا مال کرے گا اور اس کی عدالت عام ہو گی۔

علی عقبہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں:

---

۱. الشیخ الشبلنجی، نور الابصار فی مناقب آل بیت النبی المختار، ص ۲۰۰۔

''اذا قام القائم، حکم بالعدل وارفع الجور فی ایامہ و آمنت بہ السبل و اخرجت الارض برکاتها و رد کل حق الی اهله ولا یجد الرجل منکم یومئذ موضعا لصدقتہ ولا لبرہ لشمول الغنی جمیع المومنین''[۱]۔

ترجمہ: جب قائم قیام کرے گا، عدالت کے میزان پر حکم کرے گا، اس کے دور میں ظلم وجور کا خاتمہ ہو جائے گا اور راستوں میں اس کے وجود کے پرتو سے امن وامان ہو گا اور زمین اپنی برکتیں خارج کرے گی اور ہر صاحب حق کو اس کا حق ادا کر دیا جائے گا، اور کسی کو ایسا کوئی مستحق نہیں ملے گا جسے وہ اپنا صدقہ اور خیرات دے سکے اس لئے کہ اس دور میں سارے مومنین غنی ہو چکے ہوں گے۔

ایک دوسری روایت میں وارد ہوا ہے:

''یملا اللہ بہ الارض عدلا و قسطا بعد ماملئت ظلما و جورا''[۲]۔

ترجمہ: خداوند عالم (مہدیؑ) کے ذریعہ زمین کو عدل وانصاف سے مالامال کر دے گا جس طرح وہ ظلم وجور سے بھری ہو گی۔

۹. ترقی اور فلاح و بہبودی

امام مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف کے دور میں صنعت اور ٹکنالوجی اپنی ترقی کی آخری حدوں پر ہو گی، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ اس دور میں اقتصادی اور علمی ترقی اپنے عروج پر ہو گی، اس دور میں ہر علم اپنے کمال پر ہو گا، اس سلسلہ میں روایتیں بھی وارد ہوئی ہیں جیسا کہ ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

''العلم سبعۃ و عشرون حرفا فجمع ما جائت بہ الرسل حرفان، فلم یعرف الناس حتی الیوم غیر الحرفین فاذا قام قائمنا اخرج الخمسۃ والعشرین حرفا فبثها فی الناس ضم الیها الحرفین حتی یبثها سبعۃ و عشرون حرفا''[۳]۔

---

۱. لطف اللہ، صافی گلپایگانی، منتخب الاثر، ص۱۷۰۔
۲. ابو علی، فضل بن حسن طبرسی، اعلام الوریٰ، ص۹۸۔
۳. محمد باقر، مجلسی، بحار الانوار، ج۵۲، ص۳۳۶۔

ترجمہ: علم کے ستائیس حروف ہیں اور ابھی تک تمام انبیائے الٰہی جو لوگوں کے لئے علم و دانش کا خزانہ لائے وہ دو حرف سے زیادہ نہیں تھا اور لوگوں کو بھی ان دو حروف سے زیادہ کچھ نہیں معلوم لیکن جب ہمارا قائم(عج) قیام کرے گا تو وہ باقی پچیس حروف کو آشکار کرے گا اور انہیں لوگوں کے درمیان عام کرے گا اور ان باقی پچیس حروف کو ان دو حروف میں ادغام کر دے گا۔

ایک دوسری حدیث میں وارد ہوا ہے:

"انہ یبلغ سلطانہ المشرق والمغرب و تظھر لہ الکنوز و لا یبقی فی الارض خراب الا یعمرہ"[1]۔

ترجمہ: حضرت مہدی(عج) کی حکومت مشرق و مغرب پر چھا جائے گی اور زمین کے خزانے ظاہر ہو جائیں گے اور پوری دنیا میں کہیں بھی کوئی ویرانی اور تباہی و بربادی کا نشان نہ ہوگا مگر یہ کہ اسے تعمیر کر دیا جائے گا۔

ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اذا قام قائمنا وضع یدہ علی رؤوس العباد فجمع بھا عقولھم و کملت بھا احلامھم"[2]۔

ترجمہ: جب ہمارا قائم(عج) قیام کرے گا، اپنا ہاتھ بندوں کے سروں پر پھیرے گا جس سے ان کی عقلیں مجتمع ہو جائیں گی اور ان کا رشد کامل ہو جائے گا۔

۱۰. عشق و معنویت

آخری عالمی اسلامی نظام میں معنویت عروج پر ہوگی، ایک روایت میں وارد ہوا ہے:

"رجال لا ینامون للیل لھم دوی فی صلاتھم کدوی النحل یبیتون قیاما علی اطرافھم"[3]۔

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہوں گے جو راتوں میں نہیں سوتے اور نمازوں میں اس طرح گریہ و زاری کرتے ہیں جس طرح شہد کی مکھی زمزمہ کرتی ہے اور پوری رات اپنے آس پاس کی حفاظت میں کاٹ دیتے ہیں۔

---

۱. محمد بن علی الصبا، اسعاف الراغبین، ص ۱۴۰۔
۲. بحار الانوار، ج ۵۲، ص ۳۲۸۔
۳. بحار الانوار، ج ۵۲، ص ۳۰۷۔

۱۱. صلح و سلامتی

اس حکومت میں سلامتی، ترقی اور معنویت کا بول بالا ہو گا، ایک حدیث میں وارد ہوا ہے :

"حتی تمشی المراۃ بین العراق الی الشام لا تضع قدمیھا الا علی النبات و علی راسھا زینتھا لا یھیجھا سبع ولا تکافۃ"[۱]۔

ترجمہ : راستوں میں ایسا امن و امان ہو گا کہ اگر ایک عورت عراق سے شام کی طرف سفر کرے تو اس کا کوئی بھی پیر سبزہ کے علاوہ کسی اور چیز پر نہیں پڑے گا، اس کے سر پر اس کے زیورات سجے ہوں گے اور اسے کسی درندہ کا خوف لاحق نہ ہو گا اور نہ ہی کوئی درندہ اسے آزار پہنچائے گا۔

۱۲. رضایت و خوشنودی

اسلام کی عالمی حکومت ایسی ہو گی جس پر پورا آسمان اور ساری زمین راضی ہو گی یعنی آسمان و زمین مل کر اس سے رضایت کا اعلان کریں گے، یہ ایک ایسی حکومت ہو گی "یحبہ اھل السموات والارض"[۲]۔ آسمان اور زمین والے خوش ہوں گے اور اس کی برکتیں ہر ایک کے شامل حال ہوں گی اور اس سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہو گا۔

۱۳. نعمت و اطاعت

خداوند عالم ان صالح بندوں کے ذریعہ اپنی برکتیں نازل کرے گا جن کے ہاتھوں میں اسلام کی عالمی حکومت کی باگ ڈور ہو گی، ایک حدیث میں وارد ہوا ہے :

"یتمسحون بسرج الامام تطلبون بذلک البرکۃ"[۳]۔

ترجمہ : یہ لوگ اپنے امام(ع) کے گھوڑے کی زین کا بوسہ دیں گے اور اس طرح برکت کو حاصل کریں گے۔

اس عالمی حکومت میں امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کی اطاعت جامع و کامل ہو گی، ایک حدیث میں وارد ہوا ہے :

"و یقونہ بانفسھم فی الحروب و یکفونہ ما یرید منھم"[۴]۔

---

۱. منتخب الاثر، ص ۴۷۴۔
۲. محمد محمدی، ری شہری، میزان الحکمہ، ترجمہ حمید رضا شیخی، ص ۱۸۷۔
۳. محمد محمدی، ری شہری، میزان الحکمہ، ترجمہ حمید رضا شیخی، ص ۱۸۷۔
۴. ایضاً۔

ترجمہ: پورے دل وجان سے جنگوں میں اپنے امام (ع) کی مدد کریں گے اور اپنے امام (ع) کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔

خلاصہ کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی انقلاب کی نظر میں مطلوب عالمی نظام وہ ہے جس میں درج ذیل خصوصیات پائی جاتی ہوں:

الف: یہ نظام جسے نظام امامت وامت کے نام سے بھی یاد کیا جاسکتا ہے، ایک زعیم اور رہبر کے زیر نگرانی قائم ہوگا۔ امام معصومؑ علم لدنی، عصمت اور امداد الٰہی کے ذریعے ایک عادلانہ نظام کی بنیاد رکھیں گے اور تمام اقوام و ملل، حکومتوں اور سرزمینوں کو امت واحدہ کی صورت میں انسانی و اسلامی کمال کی جانب ہدایت فرمائیں گے۔ پس معلوم ہوا کہ اسلام کے عالمی نظام میں امامت و رہبری کی تین خصوصیات ہیں؛

۱. رہبر، عقیدہ، معنویت اور سیاست کا قطب شمار ہوتا ہے۔
۲. امام، مستقیم اور غیر مستقیم طریقے سے خدا کی جانب سے منتخب ہوتا ہے۔
۳. امامت کا تحقق اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالنا لوگوں کے قبول کرنے پر موقوف ہے[۱]۔

ب: عالمی اسلامی سماج ایک ترقی یافتہ سماج ہوگا جس میں اقدار و صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں گی اور انسانوں کی روحی و معنوی ضرورتیں پوری ہوں گی۔ اس نظام میں دوگانہ پالیسی، نادانوں کی رہبری، انسانوں کے خطاپذیر قوانین، شیطان اور انسانوں کی حاکمیت (جو ہر قسم کے جنگ وجدال کا باعث ہیں) اسی طرح دنیوی جھگڑوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

ج: عالمی اسلامی سماج اور نظام میں انسان زمین پر حاکمیت اور مخلوقات پر قیادت کو خدا کے منتخب بندے کے سپرد کردیں گے، حقیقت میں خدا کی حاکمیت امام معصوم علیہ السلام کے ارادوں کی صورت میں متجلی ہوگی اور موجودہ دور میں علاقوں کی تقسیم اور سرحدیں وغیرہ سب ختم کردی جائیں گی۔

عالمی اسلامی نظام کا گذشتہ اور مستقبل میں رونما ہونے والے تمام عالمی نظاموں سے موازنہ کرنا کسی بھی حالت میں صحیح نہیں ہے۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض نظام لفظی اور ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے اسلامی نظام سے مشابہ ہوں لیکن محتوی اور معنوی اعتبار سے ان میں کوئی تشابہ نہیں ہے۔ اسلامی انقلاب ایک ایسے ہی نظام کا طرفدار اور منادی ہے اور ایک ایسے ہی الٰہی نظام کی طرفداری اور اس کے قیام کی جانب گامزن ہونے کی وجہ سے اس وقت مغربی نظام کے ٹھیکیدار اسے اپنا

---

۱. محمد حکیمی، جہانی سازی اسلامی و جہانی سازی غربی، فصلنامہ نامہ کتاب نقد، ش ۲۴، ۲۵، پاییز و زمستان، ۱۳۸۱، ص ۱۰۵، ۱۲۴۔

رقیب اور اپنے راستہ کا سب سے بڑا پتھر سمجھتے ہیں اس لئے کہ اسلامی انقلاب نے فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ موجودہ سماجی اقدار کی جگہ نئے اور واقعی اقدار کو عام کرے گا۔

نتیجہ

مہدویت اور گلوبلائیزیشن آج کے دور کے اہم مباحث میں شامل ہے۔ منجی عالم بشریت اور مہدویت کا عقیدہ اس وقت تمام انسانوں کا دینی و مذہبی عقیدہ بن چکا ہے۔ مختلف ادیان و مذاہب میں منجی کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے جیسے یہودی اور عیسائی مذہب میں مسیحا اور اسلام میں مہدی(عج) کے نام سے جاناجاتا ہے، منجی یعنی ابدی سعادت کے لئے ایک نیا راستہ دکھانے والا۔ اس کے علاوہ ایک دوسری تعبیر بھی عام ہوئی ہے جسے گلوبلائیزیشن (عالمی ہونا) کہاجاتا ہے یا مارشل مک لوہان کی تعبیر کے مطابق عالمی گاؤں کے نام سے معروف ہے۔ اکیسویں صدی میں خواستہ و نخواستہ ہر حال میں ہمارا سروکار ایسے مفاہیم سے رہے گا اور یہ مفاہیم آخر الزمان میں منجی اور مہدویت کے موضوع سے متعلق ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ گلوبلائیزیشن اور حضرت مہدی(عج) کی حکومت کے درمیان رابطہ ہے اور شاید اس مفہوم کے ذریعہ ہم حضرت مہدی(عج) کی عالمی حکومت کو بہتر انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔ اگرچہ گلوبلائیزیشن پر متعدد اشکال وارد ہیں اسی لئے گلوبلائزیشن اپنے تمام معنوں میں ہرگز اسلامی مہدویت کے مفہوم سے برابری نہیں کرسکتا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلامی مفاہیم میں کہیں بھی گلوبلائزیشن پر مشتمل کوئی مفہوم استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ صرف اور صرف اسلام کی عالمی حکومت، حضرت مہدی(عج) کی عالمی حکومت جیسے مفاہیم استعمال ہوئے ہیں[1]۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان ہمیشہ سے ایک عالمی نظام قائم کرنے بلکہ دین سے جدا ایک من پسند نظام حکومت کی بنیاد ڈالنے کے درپے رہا ہے، یہ وہ احساس ہے جسے ہم بخوبی گذشتہ حکومتوں اور شہنشاہوں کی تاریخ میں مشاہدہ کرسکتے ہیں اور آج کا یہ مفہوم محتویٰ کے اعتبار سے نیا نہیں ہے بلکہ جب سے انسان نے زمین پر قدم رکھا تب سے یہ حقیقت زندہ ہے لیکن اس نے ہمیشہ اسے ایک نئی اصطلاح اور نیا مفہوم گردانا ہے اس لئے کہ ہمیشہ اس کے ہمراہ اجتماعی اور صنعتی عناصر مدغم رہے ہیں، تامیلسون کا بھی عقیدہ ہے کہ گلوبلائزیشن ایک پیچیدہ نظام ہے جو بہت تیزی سے عام ہورہا ہے اور اس وقت وہ ہمارے درمیان ماڈرن زندگی کی شکل میں قابل مشاہدہ ہے۔

---

۱. جہانی سازی اسلامی و جہانی سازی غربی، ص ۱۰۵۔

تو معلوم ہوا یہ دونوں مفہوم ایک ہی جہت میں گامزن ہیں اور دونوں میں کافی مشابہت بھی پائی جاتی ہے اور دونوں عالمی پیمانہ پر سرگرم عمل بھی ہیں۔ اسی بنا پر اسلامی مہدویت کو گلوبلائزیشن کے ساتھ تطبیق دینا بہت ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں فکری و فرہنگی ابعاد پر زور دینا ہوگا تاکہ ہم لوگ آسانی سے مدینہ فاضلہ کو گلوبلائزیشن کے ساتھ موازنہ کر سکیں اور پھر یہ بات سامنے آئے گی کہ گلوبلائزیشن مغربی طریقہ کار سے متاثر ہے جب کہ میڈیا اسے بہت صاف ستھرا پیش کر رہی ہے۔ لیکن اسلامی تحریکیں اس کی واقعیت کو سمجھنے کی بنا پر اس کے خلاف محاذ قائم کئے ہوئے ہیں اور انہیں پورا یقین ہے کہ موجودہ مغربی نظام جو پوری دنیا پر چھایا ہے ہرگز وہ مدینہ فاضلۂ مہدوی پر منطبق نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اسلام نے انسانوں کو معرفت کے آئینہ میں دیکھنے اور اس کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے اور اس زاویۂ نظر سے مغربی نظام، انسانوں کے حق سے کوسوں دور ہے۔

مغربی نظام ایک سیکولر نظام ہے اسی لئے اس پر سیکولر قوانین اور اصول حاکم ہیں، اس نظام میں انسانوں کا فہم و شعور عقل کی حد تک محدود ہے بلکہ اس نظام میں خدا لایعنی ہے، موجودہ صدی میں ٹکنالوجی کی ترقیات کی بنا پر گلوبلائزیشن پوری طرح سے میدان میں اتر چکا ہے بلکہ اپنی ترقی کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے، گذشتہ صدیوں میں بات چیت کے ذریعہ انسان ایک دوسرے سے رابطہ برقرار کرتے تھے لیکن موجودہ دور کی ترقیات نے اس بات چیت اور کتابت کو کمیت و کیفیت میں بدل دیا ہے، گذشتہ دور میں بہت کم لوگوں کو دنیا کی خبر ہوا کرتی تھی لیکن اس دور میں ہر انسان کو ذرائع ابلاغ کی وجہ سے ہر نئے حادثے کی خبر ہوتی ہے، گذشتہ دور میں انسان اپنے قبائلی نظام، زمان اور مکان کی وجہ سے بطور مشخص پہچانے جانتے تھے لیکن گلوبلائزیشن کے بعد دنیا کے تمام انسان ایک نئی پہچان سے روبرو ہیں، یہی واقعہ عصر مہدویت میں بھی ہوگا اس زاویۂ نظر سے دیکھا جائے تو گلوبلائزیشن اور نظام مہدویت میں یکسوئی دکھائی دیتی ہے[۱]۔

اسلامی نقطہ نظر سے جب انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو یقین ہو جاتا ہے کہ ایک دن ضرور حق کی حکمرانی ہوگی، خدا کا وعدہ پورا ہوگا اور مدینہ فاضلہ کا قیام عمل میں آئے گا، ایسا سماج بنانا سنت الٰہی ہے اور عصر مہدی(عج) کسی خاص قوم یا قبیلہ یا سرزمین سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ وعدہ دنیا کے ہر انسان کے لئے ہے، حضرت مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف کا انتظار کرنا حقیقت میں پوری انسانیت کا انتظار ہے، فکر مہدویت، انسانی فطرت کا اٹوٹ حصہ ہے، ہر انسان کی شناخت الٰہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ ایک عادلانہ سماج کا خواہاں ہوتا ہے، عصر مہدویت میں امام علیہ السلام خدا کی جانب سے بندوں پر لطف ہیں جو لوگوں کی

---

۱. اسلام و جہانی شدن، ص ۳۱۶۔

ہدایت کرتے ہیں اور سعادت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور موجودہ دور کے برخلاف اس دور میں انسانوں کو فضیلت و سعادت کی جانب دعوت دی جائے گی۔ حضرت مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف کے دور میں علم بام عروج پر ہوگا اور انسانی عقل و شعور اعلیٰ منزلوں کو طے کر رہی ہوگی، اگر حضرت مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف کے ظہور میں تاخیر ہو رہی ہے تو پھر اس کا سبب لوگوں کی نادانی، جہالت اور شرائط و حالات کا فراہم نہ ہونا ہے[۱]۔

گلوبلائزیشن یعنی مغربی تہذیب میں ڈھل جانا یا امریکن تہذیب کو قبول کرنا ہرگز اسلامی و دینی تعلیمات اور مہدوی فکر و نظر سے سازگار نہیں ہے، ان دونوں کے درمیان سب سے بڑا فرق فکر و نظر کے دائرے میں ہے، نظام مہدویت اس کائنات کے پروردگار کے محور پر قائم ہے اور اس کا معیار تمام انسانوں کی آزادی، عدالت اور عقل و شعور ہے، لیکن مغربی تہذیب، دنیوی سیاست پر قائم ہے اور غیر مغربی سماج کی تاراجی اس کی پہچان ہے اس کے علاوہ گلوبلائزیشن اقتصاد اور مغربی سرمایہ داری نظام سے منسلک ہو جاتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے تو یہ فکر ہرگز مہدویت کے نظریہ سے سازگار نہیں ہو سکتی اور اگر گلوبلائزیشن کو ٹکنالوجی کی ترقی کے معنی میں لیا جائے تو پھر اس میں اور اسلامی مہدویت میں کوئی فرق نہیں ہے، پس اگر اس زاویۂ نظر سے گلوبلائزیشن کو دیکھا جائے تو وہ مہدویت کی راہ میں بظاہر اس کا حصہ نظر آتا ہے لیکن موجودہ گلوبلائزیشن کی حقیقت کچھ اور ہے اور اس کی موجودہ صورت حال کسی بھی حال میں مہدویت سے قابل قیاس نہیں ہے اور جب عصر مہدی (عج) شروع ہوگا تو دنیا اس دور کی حیرت انگیز ترقیات کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گی اور مات و مبہوت رہ جائے گی۔

منابع و مآخذ

۱. غلام رضا علی بابائی، فرہنگ روابط بین الملل، انتشارات دفتر مطالعات سیاسی و بین الملل، تہران، ۱۳۸۳ش۔
۲. محمد توحید فام، فرہنگ در عرصہ جہانی شدن؛ چالش ہا و فرصت ہا، انتشارات روزنہ، تہران، ۱۳۸۱ش۔
۳. رامین، جہان بگلو، نقد عقل مدرن، انتشارات فروزان، تہران، ۱۳۸۰ش۔
۴. داریوش شایگان، چند گانگی فرہنگی، فصل نامہ گفتگو، دی، ۱۳۷۲ش۔
۵. مجتبی امیری، نظریہ برخورد تمدن ہا، ہنٹنگٹن و منتقدانش، انتشارات دفتر مطالعات سیاسی و بین المللی، تہران، ۱۳۷۵ش۔

---

۱. مہدویت و جہانی شدن، ص ۱۳۷۔

۶. انڈورلوین، طرح و نقد نظریہ لیبرل دموکراسی، ترجمہ سعید زیباکلام، انتشارات سمت، تہران، ۱۳۸۰ش۔
۷. شہریار زرشناس، زنگ‌های انحطاط و رسوایی برای نظام های لیبرال، دموکراسی، روزنامہ قدس، ۱۹ بہمن، ۱۳۸۱ ش۔
۸. وت جونز، خداوندان اندیشہ سیاسی، ترجمہ: علی رامین، ج۲، انتشارات امیر کبیر، تہران، ۱۳۸۵ش۔
۹. اسٹنتون تانسی، مقدمات سیاست، ترجمہ: ہرموز ہمایوں پور، نشر نی، تہران، ۱۳۸۱ش۔
۱۰. عبد الرحمٰن عالم، تاریخ فلسفہ سیاسی غرب (عصر جدید و سدہ نوزدہم)، انتشارات دفتر مطالعات سیاسی و بین‌المللی، تہران، ۱۳۷۷ش۔
۱۱. مصطفیٰ کواکبیان، دموکراسی در نظام ولایت فقیہ، انتشارات سازمان تبلیغات اسلامی، تہران، ۱۳۷۰ش۔
۱۲. نوام چامسکی، دموکراسی بازدارندہ، ترجمہ: غلام رضا تاجیک،، انتشارات کیہان، تہران، ۱۳۷۲ش۔
۱۳. محمد تقی مصباح یزدی، نظریہ سیاسی اسلام، ج۱، انتشارات موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ، قم، ۱۳۷۸ش۔
۱۴. علی غفوری، اسلام و اعلامیہ جہانی حقوق بشر، مجموعہ حقوق بشر از منظر اندیشمندان، انتشارات شرکت سہامی انتشار، تہران، ۱۳۸۰۔
۱۵. علی میر سیاسی، دموکراسی یا حقیقت، انتشارات طرح نو، تہران، ۱۳۸۱ش۔
۱۶. پل سوئزی و ادوارد باتالوو، نقدی بر پارہ ای از نظریہ های رائج در سرمایہ داری غرب، ترجمہ: فرہاد نعمانی و منوچہر سناجیان، انتشارات جاویدان، تہران، ۱۳۵۶۔
۱۷. حمید مولانا، ظہور و سقوط مدرن، انتشارات کتاب صبح، تہران، ۱۳۸۰ش۔
۱۸. علی اسدی، افکار عمومی وارتباطات، انتشارات سروش، تہران، ۱۳۷۱ش۔
۱۹. سی، بی مکفرسون، جہان واقعی دموکراسی، ترجمہ علی معنوی تہرانی، انتشارات آگاہ، تہران، ۱۳۷۹ش۔
۲۰. فرانسیس فوکویاما، پایان نظم سرمایہ اجتماعی و حفظ آن، ترجمہ: غلام عباس توسلی، انتشارات جہان امروز، تہران، ۱۳۷۹۔
۲۱. ساموئل پ، ہنتنگتن، تمدن ہا و بازسازی نظام جہانی، ترجمہ: مینو احمد سرتیب، انتشارات کتاب سرا، تہران، ۱۳۸۰۔
۲۲. میلتون فرید من، سرمایہ داری وآزادی، ترجمہ: غلام رضا رشیدی، نشرنی، تہران، ۱۳۸۰ش۔
۲۳. رابرت، اچ، یورک، لیبرالیسم مدرن افول امریکہ در سراشیبی بہ سوی گوموراء ترجمہ: الہہ ہاشمی حائری و حسین غفاری، انتشارات حکمت، تہران، ۱۳۷۸ش۔
۲۴. ہمان، ژان ماری گنو، پایان دموکراسی، ترجمہ: عبدالحسین نیک گہر، انتشارات آگاہ، تہران، ۱۳۸۱ش۔

۲۵. دموکراسی لیبرال در تلاش برای ایجاد نوعی فاشیسم بین المللی است، روزنامہ رسالت، ۲۶ مرداد، ۱۳۸۱۔
۲۶. رحیم کارگر، آینده جهان، انتشارات بنیاد فرہنگی حضرت مہدی موعود، قم، ۱۳۸۳ش۔
۲۷. یحییٰ فوزی، اندیشہ سیاسی امام خمینیؒ، مبحث دین و سیاست، نشر معارف، قم، ۱۳۸۱ش۔
۲۸. ری کیلی و فیل مارفلیت، جہانی شدن و جہان سوم، ترجمہ: حسن نورایی بیدخت و محمد علی شیخ علیان، انتشارات دفتر مطالعات سیاسی و بین المللی، تہران، ۱۳۸۰ش۔
۲۹. ژیل کیل، ارادہ خداوند، یہودیان، مسیحیان و مسلمانان در راہ تسخیر دوبارہ جہان، ترجمہ: عباس آگاہی، انتشارات دفتر نشر فرہنگ اسلامی، تہران، ۱۳۷۰ش۔
۳۰. محمد حسین جمشیدی، ارتباط متقابل انقلاب اسلامی ایران و جنبش شیعیان عراق، مجموعہ مقالات انقلاب اسلامی و ریشہ ہای آن، ج ۲، انتشارات نہاد نمایندگی مقام معظم رہبری در دانشگاہ ہا، قم، ۱۳۷۴ش۔
۳۱. کوثر (خلاصہ بیانات امام خمینیؒ از سال ۱۳۶۷-۱۳۹۵) ج ۱، ۲، تنظیم: انتشارات موسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینیؒ، چاپ اول، ۱۳۷۱ش۔
۳۲. معصومہ عسکری، انقلاب اسلامی و ارائہ الگویی مطلوب از زن مسلمان، ویژہ نامہ ماہ نامہ پیام زن، دفتر سوم، فروردین، ۱۳۸۴ش۔
۳۳. معصومہ راغبی، چہرہ زن ایرانی در مطبوعات بیگانہ، ویژہ نامہ ماہ نامہ پیام زن، دفتر سوم، فروردین، ۱۳۸۴۔
۳۴. عباس دلال، زن در جامعہ معاصر ایرانی، ویژہ نامہ ماہ نامہ پیام زن، دفتر سوم، فروردین ۱۳۸۴۔
۳۵. محبوبہ پلنگی، زنان ایرانی از نگاہ زنان غیر ایرانی، گذری کوتاہ، ویژہ نامہ ماہ نامہ، پیام زن، دفتر سوم، فروردین ۱۳۸۴۔
۳۶. حمید احمدی، انقلاب اسلامی و جنبش ہای اسلامی در خاور میانہ عربی، مجموعہ مقالات پیرامون جہان سوم، انتشارات سفیر، تہران، ۱۳۶۹ش۔
۳۷. دست آوردہای عظیم انقلاب شکوہ مند اسلامی در گسترہ جہان، انتشارات سازمان ارتباطات فرہنگی، تہران،
۳۸. فرامرز رفیع پور، توسعہ و تضاد، انتشارات دانشگاہ شہید بہشتی، تہران، ۱۳۷۶ش۔
۳۹. عبد الوہاب فراتی، رہیافت ہای نظری بر انقلاب اسلامی، انتشارات معاونت امور اساتید و دروس معارف اسلامی، قم، ۱۳۷۷ش۔
۴۰. الشیخ الشبلنجی، نور الابصار فی مناقب آل بیت النبی المختار، انتشار الدار العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۵ق۔
۴۱. لطف اللہ، صافی گلپایگانی، منتخب الاثر، مکتبۃ الصدر، قم، ۱۳۷۳ش۔
۴۲. ابو علی، فضل بن حسن طبرسی، اعلام الوریٰ، دار المعرفۃ، بیروت۔

۴۳. محمد باقر، مجلسی، بحار الانوار، ج۵۲، دار المعرفۃ، بیروت، ۱۳۰۴ق۔
۴۴. محمد بن علی الصبا، اسعاف الراغبین، بیروت۔
۴۵. محمد محمدی، ری شہری، میزان الحکمہ، ترجمہ حمید رضا شیخی، انتشارات دار الحدیث، قم، ۱۳۷۹ش۔
۴۶. محمد حکیمی، جہانی سازی اسلامی و جہانی سازی غربی، فصلنامہ نامہ کتاب نقد، ش ۲۴، ۲۵، پاییز و زمستان، ۱۳۸۱۔
۴۷. غلام رضا بہروزلک، مہدویت و جہانی شدن، فصلنامہ کتاب نقد، ش ۲۴، ۲۵، پاییز و زمستان، ۱۳۸۱۔